ماہنامہ
براہِ راست
لاہور

جلد 12 شمارہ 10
اکتوبر 2026ء

نفرت کی سیاست اور ووٹ کا کھیل

مغربی کنارے کا ایریا ایسٹ ون (E-1) مٹانے کی تیاریاں عروج پر

کیا فلسطین ۔۔۔ قصہ پارینہ بنا دیا جائے گا؟

مقبوضہ بیت المقدس محض سوال رہ جائے گا!

۔۔۔ حماس کا مسلم حکمرانوں کے نام خصوصی پیغام ۔۔۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

The Islamic Resistance Movement
Hamas - Palestine

حركة المقاومة الإسلامية
حماس - فلسطين

Saturday, 12 September 2026

عالی جناب محترم جناب محمد شہباز شریف وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان

جناب عالی!

میں آپ کی خدمت میں اپنے عوام اور قومی مقصد کی تاریخ کے ایک انتہائی حساس موڑ پر لکھ رہا ہوں، کیونکہ ہم اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اکیاسیویں اجلاس کے اعلیٰ سطحی ہفتے کی طرف بڑھ رہے ہیں، اور یہ ایسے تیزی سے رونما ہونے والے واقعات کے درمیان ہو رہا ہے جو ہمارے نزدیک نہ صرف فلسطینیوں کی زندگیوں اور سیکیورٹی کے لیے خطرہ ہیں، بلکہ فلسطین کے مستقبل، اس کی سرزمین اور عوام کی وحدت، اور آزادی وحقِ خودارادیت حاصل کرنے کے فلسطینی عوام کے حق کے لیے بھی خطرہ ہیں۔

ہم نے جنگ کے خاتمے اور جنگ بندی کو مستحکم کرنے کی کوششوں کو ذمہ داری اور مثبت جذبے کے ساتھ اپنایا ہے، اور ہم نے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے منصوبے کے دوسرے مرحلے کی طرف منتقل ہونے کے لیے پیس کونسل کی طرف سے پیش کیے گئے روڈ میپ کو قبول کیا، جس میں معاہدے پر مکمل عمل درآمد اور جنگ کے خاتمے کی طرف بڑھنے کے انتظامات شامل ہیں۔ تاہم، مسلسل خلاف ورزیاں اور اس عمل کے تقاضوں کی پاسداری سے غاصبانہ نظام کا انکار، اس معاہدے کے مستقبل کو سنگین خطرے میں ڈال رہا ہے۔

جنگ، تباہی، نقل مکانی اور اپنے دہائیوں ہزاروں بیٹوں اور بیٹیوں کو کھونے کے بعد ہمارے عوام نے جو کچھ برداشت کیا ہے، اس کے بعد بھی غزہ کی پٹی میں ہمارے عوام کو جنگ بندی کی مسلسل خلاف ورزیوں کا سامنا ہے، اس کے ساتھ ساتھ امدادی رسائی، ریلیف کی کوششوں اور بحالی پر مسلسل پابندیاں قائم ہیں۔ اسی وقت، مقبوضہ مغربی کنارے اور قدس میں بستیوں کی توسیع، نقل مکانی کی پالیسیوں اور الحاق کے اقدامات میں تیزی آ رہی ہے، اور اس کے ساتھ ہی فلسطینی قیدیوں اور نظر بند افراد کو جن سنگین حالات اور خلاف ورزیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، وہ بھی جاری ہیں۔

ہم ان پیش رفتوں کو الگ تھلگ مسائل یا عارضی بحران کے طور پر نہیں دیکھتے۔ بلکہ، ہم ان کے مجموعی اثرات کو ایک ایسے خطرے کے طور پر دیکھتے ہیں جو موجودہ لمحے سے آگے بڑھ کر فلسطینی حقیقت کی جغرافیائی، آبادیاتی اور سیاسی شکل کو بدلنے، اور زمین پر ایسے حقائق مسلط کرنے تک پھیلا ہوا ہے جنہیں مستقبل میں بدلنا مشکل ہو سکتا ہے۔

اسلامی تحریک مزاحمت حماس کے طور پر اپنی ذمہ داری کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہم آپ کی خدمت میں ایک منسلکہ سیاسی بریفنگ یادداشت پیش کر رہے ہیں جس میں غزہ کی پٹی کی پیش رفت، مقبوضہ مغربی کنارے اور قدس میں بستیوں کی توسیع، الحاق اور نقل مکانی کے عمل، فلسطینی قیدیوں اور نظر بند افراد کی صورتحال، اور ان پیش رفتوں کے اسٹریٹجک اثرات کے بارے میں ہمارے اندازے اور اہم ترجیحات کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے جن کی ہمارے نزدیک موجودہ مرحلے میں ضرورت ہے۔

آپ کی خدمت میں مخاطب ہوتے ہوئے، ہم آپ کے معزز ملک کے مقام اور کردار کے ساتھ ساتھ ان مواقف کی بھی انتہائی قدر کرتے ہیں جو اس نے فلسطین اور اس کے عوام کے حقوق کی حمایت میں ظاہر کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ مرحلہ فلسطینی مقصد اور خطے کو ایسے اہم چیلنجز کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے جن کے لیے فلسطینی سرزمین اور عوام کی وحدت کو برقرار رکھنے، غاصبانہ قبضے، الحاق اور نقل مکانی کے حقائق کو مضبوط ہونے سے روکنے، اور فلسطینی قومی حقوق کے دفاع کی ضرورت ہے، جن میں سب سے پہلے ہمارے عوام کا حقِ خودارادیت اور القدس کو اس کا دارالحکومت بناتے ہوئے اپنی آزاد ریاست کا قیام شامل ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ منسلک یادداشت ان پیش رفتوں اور ان کے اثرات کو آپ کی خدمت میں سامنے لانے میں مددگار ثابت ہوگی، ایسے وقت میں جب دنیا کی نظریں نیویارک میں ہونے والے اجلاسوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور جب یہ اجلاس فلسطینی مقصد اور ہمارے عوام کے حقوق کو بین الاقوامی ذمہ داریوں میں دوبارہ سرفہرست لانے کا موقع فراہم کر سکتے ہیں۔

جنابِ عالی! براہِ کرم میری طرف سے انتہائی احترام کی یقین دہانی قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر خلیل الحیۃ

راہنما
اسلامی تحریک مزاحمت حماس، فلسطین

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام یعنی (خانہ کعبہ) سے مسجد
اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم
اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

ماہنامہ

براہِ راست

لاہور

جلد 12 شمارہ 10 اکتوبر 2026ء

مُدیر: مرزا محمد الیاس

ویب سائٹ: www.barah-i-rast.com
برقی پتہ ادارتی امور: editor@barah-irast.com
برقی پتہ انتظامی امور: contact@barah-i-rast.com

Price Rs.70
پبلشر مرزا محمد الیاس نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر 9/1A رائل پارک لاہور سے شائع کیا

اس شمارے میں

- کلام اقبال
- اداریہ

حماس کی خصوصی یادداشت

مغربی کنارے کا ایریا ای ون محض ایک کالونی نہیں

صہیونی عقوبت خانوں سے نالۂ زنجیر

بحیرۂ روم کے اس پار سے غزہ کیسا لگتا تھا

- غزہ میں تین امریکی ڈاکٹروں نے کیا دیکھا؟
- قید، تشدد اور خاموشی
- مغربی منافقت اور مغربی کنارے اسرائیلی آبادکار
- نفرت کی سیاست اور ووٹ کا کھیل
- تاریخ مسجد اقصیٰ
- اسرائیلی فوجیوں کی گواہی یا ایک متنازع دستاویزی فلم؟

کلامِ اقبال

طلوعِ اسلام

دلیلِ صُبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفُق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عُرُوقِ مُردۂ مشرق میں خُونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نُطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غُنچوں میں باقی ہے تو اے بُلبل!
”نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی“
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی
ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جُستجو کر دے

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اسرائیل کے وزیر اعظم بنیامین نتن یاہو کے آخری دورۂ امریکہ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ان کے دوسرے سال بھی بائیکاٹ، ایران کے ہاتھوں ڈونلڈ ٹرمپ کی درگت، دیوار گریہ پر حاضری اور پھر ارائیل شیرون کے بعد ان کی وزراء سمیت مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور تلمودی عبادات اور پھر فلائی دبئی کے طیارے کی مبینہ کریش لینڈنگ کو کیش کرانے میں ناکامی سب نیتن یاہو کی اسرائیل کی بدنامی، میں تازہ اضافہ، اگرچہ عارضی سہی، امارات میں طیارے اتارنے کی ممانعت نے ان کی ناکامیوں میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ ان کا دوبارہ انتخاب امریکہ سمیت مغربی ممالک کے لیے بڑا مسئلہ اور وجۂ بدنامی بن گیا ہے۔

بنیامین نتن یاہو کے وزارت عظمیٰ سے ہٹنے کی صورت میں اسرائیل کو غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینیوں کی نسل کشی کی تازہ مہم چلانے کا موقع ملے گا اور دنیا کے نوٹس لیتے لیتے ہزاروں فلسطینی شہید کر دیے جائیں گے۔

جنگی جرائم میں ملوث بنیامین کی کامیابی ٹرمپ کے یے مزید رسوائی کا سامان لائے گی۔ وہ اب بھی امریکہ کے مڈٹرم انتخابات میں ہارنے کی صورت میں اپنی صدارت ہار سکتے ہیں۔ ان کے نائب جے ڈی وینس نئے ممکنہ صدر کی امید لگائے اپنے بیانات میں امریکی مقتدرہ کی حمایت حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ ان کے بیانات میں اسرائیل کو بوکھ اور اس کی وجہ سے ایران جنگ میں رسوائی ایک مہم بن گئی ہے۔

غزہ میں نسل کشی میں اسرائیل اکیلا مجرم نہیں ہے۔ اس جرم میں امریکہ اور مغربی ممالک بھی شامل رہے ہیں۔ ان سب کو اسرائیلی انتخابات کے نتائج کا انتظار ہے۔ مغرب اب نیتن یاہو کی رخصتی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے لیے فلسطینیوں کا قتل عام کوئی بڑا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ مغرب نے 1990ء کی دہائی سے اب تک کم و بیش مسلمانوں کے بیس لاکھ افراد کے قتل میں براہ راست حصہ لیا ہے۔ وہاں کے عوام کی مخالفت وہاں کے حکمرانوں کے لیے ایک بے معنی عنصر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اہل مغرب کی طرف سے عوامی سطح کی مخالفت فلسطین کے معاملہ میں اس لیے سامنے آئی کیوں کہ جو بائیڈن، انٹونی بلنکن، ڈونلڈ ٹرمپ، مارکو روبیو اور ان کے ساتھیوں نے انتہائی بے رحمی سے مسلسل بمباری کر کے نہتے لوگوں کا بے پناہ شکار کیا۔ فلسطینی نسل مٹانے کے لیے 20 ہزار معصوم بچوں کے قتل عام پر لب کشائی تک نہ کی اور تب بولے جب شور بہت اٹھا، کیئر سٹارمر جیسے کردار اقتدار سے رخصت ہونے پر مجبور ہوئے۔

ان سب کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوا کہ غزہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ تو 22 لاکھ فلسطینیوں میں سے چالیس سال سے کم عمر ہر فرد کو اب بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس عمل میں عمر کی اس حد سے زیادہ جو بھی زد میں آ جائے وہ ان کے لیے کسی بونس سے کم نہیں ہے۔ عرب حکمرانوں کی طرف سے اور بالخصوص متحدہ عرب امارات کے اندر سے برآمد ہونے والے فرعون اور نمرود مغرب کے بڑے مالیاتی اتحادی رہے۔

وہ مثال غزہ اور اسرائیل کے بارے میں درست قرار پا رہی ہے کہ سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔ یہ تو لاکھ کے قریب انسانوں کے قتل کو بھی کم سمجھتے ہیں۔ اس کی مثال اپنی انتخابی مہم کا آغاز نتن یاہو کا دیوار گریہ پر ماتھا ٹیکنا، پھر مسجد اقصیٰ کے اندر اپنے ناپاک اور اپنی طرح غلیظ وزارتی کرداروں کے ساتھ داخل ہونا اور تلمودی عبادات بجالانا ہے۔ ان کے مذہبی راہنما، ربی اور دیگر سکالرز بار بار کہہ چکے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں ان کا تو دور کی بات، کسی عام یہودی کے داخل ہو کر تلمودی نماز ادا کرنا بھی قبول نہیں ہے۔

یہ لبرل ازم کا وہ گھناؤنا کردار ہے جو عام دنوں میں اسلام پر حملہ آور ہوتا ہے اور کسی انتخابی ضرورت پر مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اس کی ایک مثال بھارت کا نریندر سنگھ مودی ہے جو بابری مسجد شہید کرنے والوں سے لے کر، ایڈوانی اور واجپائی کی طرح سیکولر کہلواتا اور مسلمانوں کے قتل عام میں احمد آباد جیسے جلاد مودی کا کردار ادا کرتا ہے۔ نتن یاہو اب مغرب اور امریکہ کے لیے ایک بوجھ (Liability)

ہے۔اس سے نجات فلسطین کو روکنے کے لیے ان دونوں امریکہ و مغرب کی ضرورت ہے۔

یہ بات خام خیالی ہوگی کہ یاہو ہار نہ جائے۔نیفتالی بینیٹ یا کوئی اور وزیراعظم بن جائے تو فلسطینی نسل کشی رک جائے گی یا تھم جائے گی۔یہ زیادہ تیز ہو جائے گی۔نیتن یاہو بین الاقوامی مجرم ہے۔اس کی جگہ آنے والا آزاد ہوگا کہ قتل عام نئے سرے سے کرے۔اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اسے سننے والے زیادہ ہوں۔نیتن یاہو تو اب بین الاقوامی طور پر نا قابل قبول ضرور ہے لیکن اسرائیل کے اندر اس کے بجائے مقابلہ کانٹے کا ہوگا۔اگر وہ اپنی سیٹ ہار گیا تو کہا جا سکتا ہے کہ نیا سیاست دان حکمران بن جائے گا۔

امریکہ اور بالخصوص ٹرمپ کے لیے یہ بہت مشکل ہو گیا ہے کہ وہ اس بوجھ کو زیادہ عرصہ برداشت کر سکیں۔اس مرتبہ وہ جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں جانے کے باوجود امریکہ میں نیتن یاہو آٹھ گھنٹے بھی ٹھہر نہ سکا۔اقوام کے نئے سیکرٹری جنرل کے لیے امریکہ کی پوزیشن خاصی خراب ہوئی ہے۔اب کوسٹاریکا کی ایک خاتون کا نام لیا جا رہا ہے۔تاہم حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔

نتن یاہو نے جس بے دردی سے فلسطینیوں کی نسل کشی کی ہے، اس کی وجہ سے ہر اسرائیلی کے لیے اپنے ملک کے پاسپورٹ پر سفر کرنا، باعث عار بن گیا ہے۔اب وہ جہاں بھی جائیں گے، بالخصوص فلسطینی بچوں کی چیخیں اس کا تعاقب کریں گی۔صحافیوں کے قتل عام سے بھی اسرائیلی تنہائی مزید گہری ہو جائے گی۔ہر جرم کے اثرات ضرور سامنے آتے ہیں خواہ وقت ذرا زیادہ لگ جائے۔

نتن یاہو کے ہارنے کی صورت میں نئے اسرائیلی حکمران کے ہاتھ فلسطینی خون سے مزید رنگ دار ہو جائیں گے۔مستقبل قریب میں غزہ سے ملبہ ہٹائے جانے کا کام بھی شروع ہونے کا امکان نہیں ہے۔بورڈ آف پیس اب امریکی ڈالروں کے سہارے کام نہیں کر سکے گا۔یہ امکان زیادہ ہے کہ کبھی کام نہیں کر سکے گا۔قاہرہ سے عارضی غزہ انتظامیہ غزہ منتقل نہیں ہو پائے گی۔اسرائیلی فوج اب درندوں کا گروہ بن گئی ہے۔وہ گستاپو کی پولیس بن گئی ہے۔

اسرائیل میں یونیورسٹیوں میں ایک لاکھ ستر ہزار نوجوان زیر تعلیم ہیں۔ان میں سے 80 ہزار سے جبری فوجی حاضری بھی ممکن نہیں رہی۔یہ نوجوان کسی فوجی سروس کے لیے دستیاب نہیں ہوں گے۔یہ بھی اسرائیل کے لیے مستقل مسئلہ ہے۔جو فوجی غزہ میں قتل عام میں کسی بھی درجے میں ملوث رہے ہیں، ان کی بحالی عبوری فوجی مراکز میں ممکن نہیں رہے گی۔ان کے لیے تباہ حال اسرائیل میں ٹراما سنٹرز کی سخت ضرورت پڑے گی۔

جہاں تک غزہ کو ساحلی تفریح گاہ بنانے کا معاملہ ہے، وہ اب ممکن نہیں رہا ہے۔یو اے ای سے اسرائیلیوں کا انخلاء جاری ہے۔وہ ویران اسرائیل میں واپس جانے پر مجبور ہیں۔

اب محمد بن سلمان اور امیر قطر کے لیے، شیخ محمد بن جاوید اور ایلون مسک کے لیے غزہ میں سرمایہ کاری مشکل ترین فیصلہ ہوگی۔غرض یہ کہ اب اسرائیل اور امریکہ کے لیے غزہ ایک نرم چارہ نہیں رہے گا۔یہ بات دور از امکان لگتی ہے کہ غزہ کے اندر ییلو لائن یا کوئی اورنج لائن برقرار رہ سکے۔یہاں تعینات اسرائیلی فوج کو اپنے ملک کے اندر زیادہ ہو جائے گی جب ایران کی پیدل فوج، ٹینک اور توپ خانہ اسرائیل کے اندر داخل ہونے کے قریب ہوں گے۔

ان حالات میں نیتن یاہو کی تا مودی عبادات کامیاب ہو بھی جائیں تو اس پورے خطے کے ایک بہت خوفناک جنگ میں ملوث ہو جانے سے مغربی کنارہ اور مقبوضہ بیت المقدس پر اسرائیلی دباؤ تبدیل ہوگا۔وہاں نسل کشی فوری طور پر بڑھنے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔

جہاں تک حماس کے غیر مسلح ہونے کا معاملہ ہے، اسے اب دنیا بھول جائے، یوں لگتا ہے کہ حماس غزہ اور اس کے ساتھ پہلی مرتبہ مغربی کنارے اور مقبوضہ بیت المقدس میں سیاسی قوت کے طور پر ابھر سکتی ہے۔اگر ایسا ہوا تو یہ امریکہ، اسرائیل اور مغرب کے لیے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں ہوگا۔

اب امریکہ، اسرائیل، مغرب، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کی کوششوں کے برعکس نیا مشرق وسطیٰ سامنے آئے گا۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

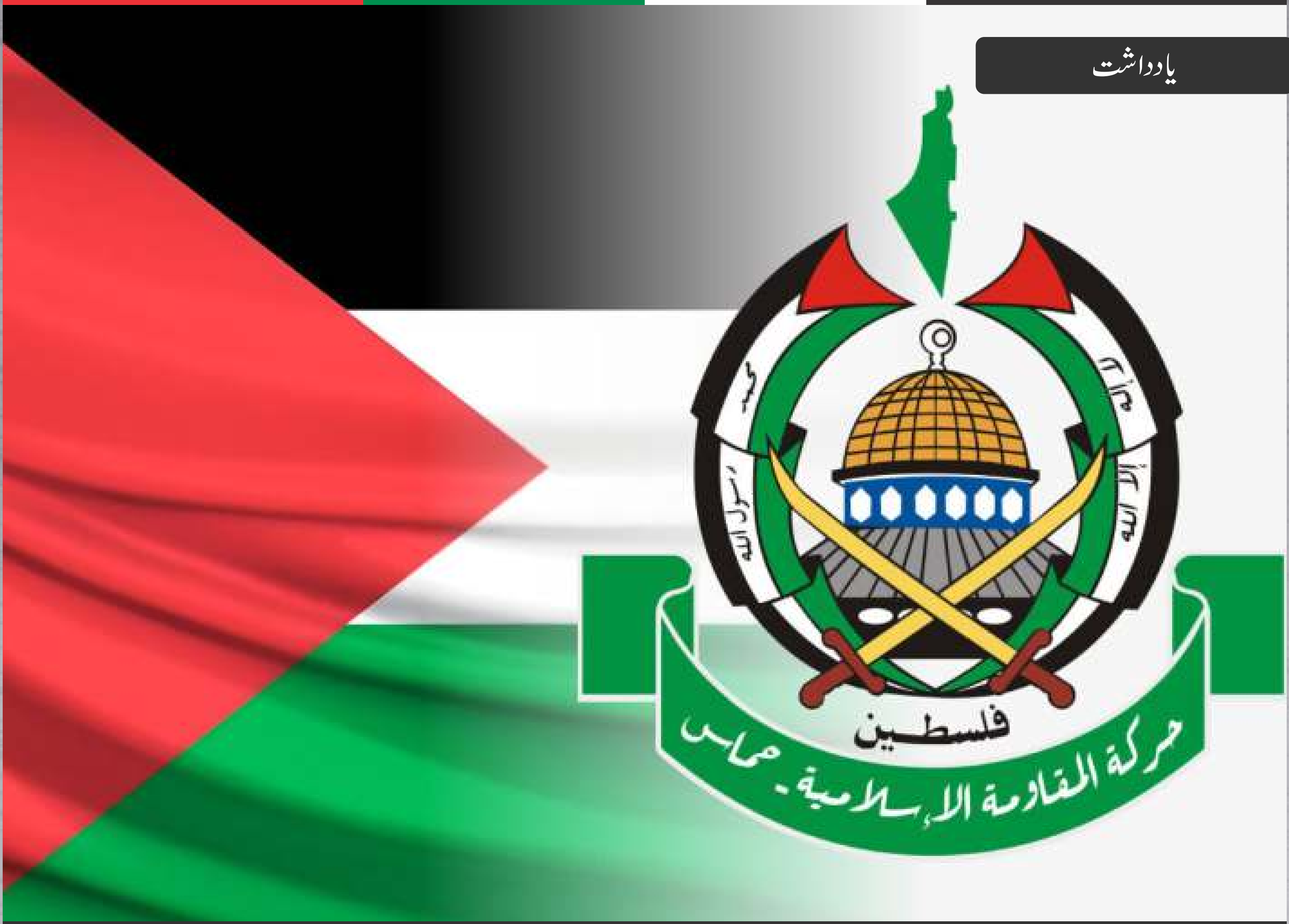

حماس کی خصوصی یادداشت

جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے اعلیٰ سطحی 81ویں خصوصی اجلاس کے موقع پر فلسطین میں صورت حال

اس وقت فلسطینی عوام کا معاملہ تاریخ کے انتہائی خطرناک موڑ میں داخل ہو چکا ہے۔ ایک طرف انسانی بنیادوں پر جن تکالیف سے بھرپور حالات سے غزہ کا ہر فلسطینی گزر رہا ہے اور اس پر اسرائیلی جارحیت اور حملوں کا تسلسل سے نسل کشی کو جاری رکھا جانا پوری دنیا کے سامنے ہے، مقبوضہ مغربی کنارے اور مقبوضہ بیت المقدس میں بھی یہ سلسلہ بلا روک ٹوک جاری ہے۔ تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں نے ان علاقوں کی ساری سرزمین کو شدید خطرات اور حقیقت پر مبنی خدشات کے پیش نظر صہیونی عزائم کی نذر کر دیا ہے۔ اس سے اب قانونی اور سیاسی فریم ورک بھی تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلیاں ایک نئی اور پیچیدہ حقیقت کے زبردستی پیدا کیے جانے کو عمل میں لا رہی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو اس کو درست کرنا نہایت مشکل تر ہو جائے گا۔ اسی طرح فلسطینیوں کے استصواب رائے کے حق سے محروم کرنے کا سبب بن جائے گا۔ اس طرح ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا امکان مٹا دیا جائے گا۔

ہم آپ کے سامنے نہایت اہم حقائق پر مبنی ان تبدیلیوں کو رکھنا چاہتے ہیں جو اس سارے غاصبانہ عمل سے سامنے لائی جا رہی ہیں، ہم ان کے سیاسی مضمرات سے بھی آپ کو آگاہ کر رہے ہیں۔ ہم ان اہم ترجیحات کو بھی پیش کر رہے ہے جن کا عرب، اسلامی اور بین الاقوامی سطحوں پر فوری نوٹس لینے کی ضرورت بہت اہم ہے۔

اول: غزہ کی پٹی:۔

غزہ کی پٹی میں حالات میں امن و استحکام لانے کے لیے جنگ بندی معاہدے کو سال ہونے کو آیا ہے۔ یہ معاہدہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے 20 نکاتی پروگرام کے تحت 10 اکتوبر 2025ء کو طے پایا تھا۔ اس کے معاہدے کے باوجود روزانہ کی بنیاد پر اسرائیلی بمباری، فلسطینیوں کا بے دریغ اور ظالمانہ قتل، املاک کو نذر آتش کرنا بھی ہنوز جاری ہے اور دھماکہ خیز مواد سے بچی کھچی عمارتوں کو منہدم کرنے کا عمل بھی جاری ہے۔ اس سے فلسطینی شہادتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

فلسطینی فیلڈ دستاویزات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بندی کے 330 دنوں میں اسرائیل نے معاہدے کی 4,691 مرتبہ خلاف ورزی کی ہے۔ یہ تعداد 6 ستمبر 2026ء تک کی ہے۔ یہ روزانہ کی اوسط کے اعتبار سے 14.1 خلاف ورزیاں بنتی ہیں۔ ان کی وجہ سے 1352 فلسطینی (بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور خواتین) شہید جب کہ 4,511 زخمی ہو چکے ہیں۔ (ان کے بعد صرف ایک دن میں 112 فلسطینی شہید کیے گئے، ان میں خاصی تعداد بچوں کی ہے)۔ یہ تعداد اس تعداد کے مطابق ہے جس کا تذکرہ

اس عرصے میں اقوام متحدہ نے کیا ہے۔

اسی طرح سے بہ ظاہر ییلو لائن کے پار اسرائیلی فوج کی غزہ کے اندر دخل اندازیاں اس قدر بڑھی ہیں کہ اب وہ غزہ کی 65 فیصد سرزمین پر قابض ہو چکا ہے۔ (یہ بات آر ریکارڈ ہے کہ نیتن یاہو نے اپنی قابض افواج کو غزہ کے 70 فیصد رقبے پر قبضہ کرنے کے احکام جاری کیے ہیں۔ تل ابیب کے ایک سیمینار میں یاہو سے یہودیوں نے مطالبہ کیا کہ وہ 100 فیصد غزہ پر قبضہ کیا جائے تو یاہو نے جواب دیا کہ ٹھنڈا کر کے کھائیے، یہ قبضہ 100 فیصد بھی ہو جائے گا)۔ غزہ کے ساتھ ساتھ ییلو لائن مغرب کی سمت سے اندر کی جانب بڑھائی جا رہی ہے۔ اس طرح تقریباً 21 لاکھ آبادی کو مزید محدود کیا گیا ہے اور جس سے 35 فیصد غزہ میں آبادی کے بڑھتے مسائل سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

جو جنگ بندی معاہدہ ہوا تھا، وہ شدید خطرات کی زد میں ہے۔ قابض حکومت کے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس حکومت کی معاہدے پر عمل درآمد میں مسلسل ناکامی بالکل عیاں ہے اور طے شدہ امور مسلسل پامال کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح جنگ بندی مذاق بن جانے کی وجہ سے کسی بھی وقت اصل مقصد سے ہٹ رہی ہے۔ اس صورت میں سابقہ حالات پھر سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

اگر صورت حال کو انسانی سطح پر دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کے اندازوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ 19 لاکھ 80 ہزار افراد (غزہ کی آبادی کے 94 فیصد لوگ) کو نہ صرف پناہ کی ضرورت ہے بلکہ اشیائے ضروریہ بہت لازمی ہو گئی ہیں۔ غزہ میں ان لازمی اشیاء کا داخلہ بھی ایک سوال ہے۔ کسی نوعیت کا سامان اور دیگر سپلائز مسلسل روکی جا رہی ہیں۔ اس وجہ سے انسانی سطح پر بحران آئے روز شدت اختیار کر رہا ہے اور دوبارہ سے آبادکاری کا امکان ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اکتوبر 25 کے معاہدے پر عمل درآمد کے لیے جو میکانزم طے کیا گیا تھا، تقریباً 69,000 ٹرک اور تقریباً 35 فیصد متوقع امداد 600 ٹرک روزانہ کی بنیاد پر غزہ میں داخل ہونا تھی، لیکن اس پر اس سال 6 ستمبر تک عمل نہیں کیا گیا ہے۔ حال ہی میں یونیسف نے جو اعداد و شمار جاری کیے ہیں، وہ صورت حال میں تیز رفتار ابتری کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس میں پانی کی عدم فراہمی اور سینی ٹیشن کے امور نہایت سنگین ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ کم جگہ میں غزہ کی پوری موجودہ آبادی کا ارتکاز بھی ہے۔

دوم: مقبوضہ مغربی کنارہ اور مشرقی بیت المقدس:۔

غزہ کی صورت حال کے بالکل متوازی کیفیت مغربی کنارے میں ہے جہاں یہودی نوآبادکاروں کی نئی بستیاں تیزی سے بنائی جا رہی ہیں۔ آبادکار یہودیوں کا تشدد جاری ہے۔ وہ فلسطینیوں کو بے گھر اور بے در کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے خلاف نام نہاد قانون کو حرکت میں لایا جا رہا ہے اور انتظامی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ان اقدامات سے قبضہ مستحکم ہو رہا ہے اور مغربی کنارے کی زمین یہودی آبادکاروں کے قبضہ میں جا رہی ہے۔

اگست 2026ء کے اختتام تک اقوام متحدہ نے ان قبضہ گروپوں کے ہاتھوں 82 فلسطینیوں کی شہادت نوٹ کی ہے۔ یہ اس سال کے شروع سے لے کر اگست تک کی شہادتیں ہیں جب کہ ان واقعات میں زخمی کیے جانے والے فلسطینیوں کی تعداد 11,00 سے زیادہ ہے۔

آبادکاروں کا تشدد اور ان کی بستیوں کی تعمیرات تک فلسطینی بڑی تیزی سے بے گھر کیے جا رہے ہیں۔ اب تک 25,00 فلسطینی بے گھر اور بے دخل کیے جا چکے ہیں۔ یہ تعداد صرف 2026ء کی ہے۔ اب تک 6500 افراد بے گھر اور بے دخل کیے جا چکے ہیں۔

ان واقعات کے بالکل متوازی مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنے کے انتظامات اور اقدامات (برازیل سموٹریش کی سرپرستی میں) کیے جا رہے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا کہنا ہے کہ ضم کرنے کے اقدامات کے لیے اب تک 11 بل کیبنیٹ سے منظور کرائے گئے ہیں۔ یہ منظوری 2023ء سے 2025ء کے درمیانی عرصہ میں کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ 21 بل ایسے ہیں جو پیش کر کے مغربی کنارے میں مختلف نوعیت کے اقدامات کی منظوری لی جا چکی ہے۔ ان کے تحت مقبوضہ مغربی کنارے میں اسرائیلی قانون کی خودمختاری کی منظوری لی گئی ہے۔

ان منصوبوں میں سے سب سے خطرناک منصوبہ E-1 ہے۔ یہاں 3,400 آبادکاری یونٹس بنائے جا رہے ہیں۔ یہ منصوبہ بیت المقدس کے مشرق کی سمت شروع کیا گیا ہے۔ یہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے شمالی اور جنوبی مغربی کنارے کے عین درمیان واقع ہے۔ اس کے مکمل ہونے سے بیت المقدس اپنی فلسطینی حدود سے الگ تھلگ ہو جائے گا۔

مشرقی مقبوضہ بیت المقدس میں تقریباً 200 فلسطینی خاندان، جو کم و بیش 9500 نفوس پر مشتمل ہیں، ان کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف علاقہ خالی کرنے کے مقدمات حتمی مراحل میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ مقدمات زیادہ تر آبادکار تنظیموں نے دائر کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی استحکام کے حامل فلسطینی بار بار پامال کیے جا رہے ہیں جس سے الاقصیٰ مسجد کا مقام و مرتبہ خطرے میں ہے۔

سوم: فلسطینی نظربندوں اور قیدیوں کا معاملہ:۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی رپورٹ کے مطابق 84 فلسطینیوں کو قید یا نظربند رکھا جا رہا ہے۔ یہ مئی 2026ء تک کی رپورٹ کے اعداد و شمار ہیں۔ انتظامی نظربندوں کو مقدمات چلائے بناء نظربند رکھا گیا ہے۔ ان کی ایسی تعداد 3,376 ہے، جب کہ 1,283 نظربند ایسے ہیں جنہیں صہیونی قابض حکومت نے لاقانونیت کے مرتکب لڑاکے قرار دیا ہے۔

گزشتہ تین برسوں میں اقوام متحدہ اور دیگر انسانی حقوق کے اداروں نے رپورٹ دی ہے کہ ان سب کے خلاف مسلسل دیکھ بھال کے بغیر رکھے جانے، قید تنہائی، مار پیٹ کے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں جن سے ان کی اموات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کو میڈیکل سہولتیں بھی نہیں دی جا رہی ہیں۔

30 مارچ 2026 کو کنیسٹ نے موت کی سزا کا قانون پاس کیا ہے۔ یہ قانون 48 کے مقابلے میں 62 ووٹوں سے منظور کیا گیا ہے اس کے ساتھ ایک انتہائی خطرناک دستاویز لف ہے جس کے ذریعے خصوصی حالات میں کسی بھی قیدی یا نظربند کو موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔

سیاسی تخمینے:۔

اسلامی تحریک مزاحمت حماس کے اندر یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ اس مرحلے کی سنگینی کو کسی طرح سے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر اسے ایک الگ تھلگ کینوس کے طور پر دیکھا جائے۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی بحران اور المیہ ہے۔ اس وقت جو تنازعہ موجود ہے وہ زمین کا ہی نہیں بلکہ فلسطینی عوام کے اتحاد اور ان کے حق استصواب رائے کا بھی ہے۔ اگر ساری صورت حال کو مجموعی تناظر میں رکھا جائے تو یہ حالات سامنے آتے ہیں:

اول: اشارے اور علامتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ حالات جس سمت میں تیز رفتاری سے تبدیل کیے جا رہے ہیں، وہ قبضے کو مزید پیچیدہ اور مستقل جغرافیائی اور قانونی حقائق بنانے کے ہیں۔ یہ معاملہ مغربی کنارے اور بیت المقدس میں اور بھی سنگین سے سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ ان حالات کو ان کی اصلیت کی سمت واپس موڑنا ناممکن ہوتا جائے گا۔

دوم: غزہ، مغربی کنارے، بیت المقدس اور نظر بندی کے معاملات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ سب ایک دوسرے سے باہم یکجا ہیں اور جڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے سرزمین فلسطین کے متحد رہنے کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مغربی کنارے اور دوسرے حصوں میں لوگوں کی سیاسی نمائندگی کے کسی مسلمہ طریق کار کی عدم موجودگی میں اور بھی سنگین ہو گیا ہے۔

سوم: غزہ کی پٹی میں حالات کی ابتری کے جاری رہنے سے یہ خطرہ بڑھ رہا ہے کہ غزہ میں ایک علیحدہ جغرافیائی اور یہ خطرہ بڑھ رہا ہے کہ غزہ میں ایک علیحدہ کیے جانے، الگ تھلگ انتظام کا راستہ اختیار کیے جانے سے صورت حال کے ہوا میں معلق رکھے جانے یا اسی طرح کے فریم ورکس میں مبتلا کیے جانے کا مستقل خدشہ موجود ہے۔

چہارم: یہودی بستیوں میں توسیع، فلسطینیوں کے بے گھر کیے جانے اور پھر ان کو مستقل اسرائیل میں غیر قانونی اور ناجائز طور پر ضم کیے جانے کے اقدامات تیز کیے جا رہے ہیں۔ یہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب بین الاقوامی سطح پر فلسطینی حقوق دیے جانے کے رجحانات تیز ہو رہے ہیں۔ یہ ایسا تضاد ہے کہ فلسطینی ریاست بنانے کے امکانات بھی کم ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

پنجم: بنیادی مسئلہ اب یہ نہیں ہے کہ بین الاقوامی صورت حال اور پوزیشن فلسطینی حقوق دیے جانے کے خلاف جا رہی ہے بل کہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پوزیشن کے لیے اقدامات نہیں لیے جا رہے جو حقائق تبدیل کرنے کے صہیونی اقدامات روکے نہیں جا رہے۔

اب بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قبضے اور جنگ کے نتائج کے اثرات کو کس طرح مستحکم ہونے سے روکا جائے، صورت حال کو مستقل بنیادوں پر جانے سے بھی روکا جائے اور ان اقدامات کا سدباب ہو سکے جو فلسطینی کاز کے لیے خطرہ ہیں۔ ان میں سرزمین فلسطین کا تحفظ عوام کی یکجہتی بیت المقدس کی آزادی، پناہ گزینوں کا تحفظ اور استصواب رائے کے حق کی فراہمی شامل ہیں۔

ترجیحی اقدامات:۔

مذکورہ صورت حال میں ہم ایسی کوششوں پر زور دینا چاہیں گے جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں زیر بحث لا کر بین الاقوامی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی جا سکے۔

1۔ غزہ میں جنگ بندی کا استحکام:۔

جنگ بندی معاہدے کی بار بار اور روزانہ کی پامالی روکی جائے، اسرائیلی فوج کے واضح انخلاء کا پروگرام طے ہو، تمام کراسنگز کو کھولا جائے، انسانی امداد کے غزہ میں بلا روک ٹوک داخلے کو یقینی بنایا جائے، تعمیر نو کا کام شروع کیا جائے، ہر ایسے انتظام کو مکمل مسترد کیا جائے جس سے غزہ کو جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے دوسرے فلسطینی علاقوں سے الگ کیا جا سکے۔

2۔ یہودی بستیوں کی تعمیر و توسیع روکی جائے اسرائیل میں فلسطینی ادغام کے منصوبے ختم کرائے جائیں اور مغربی کنارے سے ان کی بے دخلی اور بے گھر کرنے کے منصوبے روکے جائیں۔ خصوصی طور پر E-1 منصوبے کو روکا جائے، وہاں نام نہاد قانونی اور انتظامی اقدامات رکوائے جائیں تاکہ وہاں اسرائیلی خود مختاری قائم کرنے کو روکا جائے تاکہ فلسطینی سرزمین کی یکجہتی برقرار رکھی جا سکے۔

3۔ بیت المقدس کو تحفظ دیا جائے اور مقدس مسجد اقصیٰ کو بچایا جائے۔

4۔ فلسطینی نظر بندوں اور قیدیوں کا تحفظ یقینی بناتے ہوئے سب کی رہائی کرائی جائے۔ اس کے لیے انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی اور متعلقہ اداروں کو ان تک رسائی دلائی جائے، موت کے قانون کی مخالفت کی جائے۔

5۔ بین الاقوامی سیاسی اور قانونی راستہ کھولا جائے تاکہ فلسطینی حق استصواب کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے۔ فلسطین کو اقوام متحدہ میں مکمل رکن کا درجہ دیا جائے۔ بین الاقوامی طور پر احتساب کے عمل کو یقینی بنایا جائے۔ قبضے اور ادغام کے معاملات کو مدغم ہونے سے روکا جائے تاکہ صورت معاملہ کی پیچیدگی کو دور کیا جا سکے۔

حتمی بات:۔

اس وقت مسئلہ فلسطین ایسے مرحلے میں ہے جہاں سے واپسی آنے والے کئی عشروں تک ممکن نہیں ہو سکے گی۔ خطرہ صرف یہ نہیں ہے کہ تشدد میں اضافہ ہوتا جائے گا بلکہ موجودہ عارضی صورت حال کو مستحکم کرنے والوں کو بھی روکا نہیں جا سکے گا اور جغرافیائی، قانونی اور سیاسی حالات روکنا ممکن نہیں رہے گا۔

اسی طرح سے اس مرحلے پر فلسطینی عوام کے حقوق کو محفوظ بنانا ضروری ہے، سرزمین فلسطین کی یکجہتی، سرزمین کے ساتھ ساتھ کاز کی یکجہائی، آزادی کے حقوق پامال کرنے کی کوششوں کو ناکام بنانے، استصواب رائے کے حق کو یقینی بنانے اور آزاد فلسطین کے ریاست کے طور پر قیام کو عملی بنانا بھی لازمی ہے۔

اسلامی تحریک مزاحمت (حماس) فلسطین

پیش منظر: زینہ الطحان

مغربی کنارے کا ایریا E-1 محض ایک کالونی نہیں

دنیا بھر سے حکومتوں اور عالمی اداروں نے اسرائیلی حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے ایک تعمیراتی ٹینڈر کی مذمت میں بیانات جاری کیے ہیں۔ ان حکومتوں میں اسرائیل کی اتحادی حکومتیں بھی شامل ہیں۔ اس ٹینڈر کے ذریعے مقبوضہ بیت المقدس (یروشلم) کے مضافات میں نئی یہودی بستیوں کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔

اس غیر قانونی منصوبے کے خلاف 8 ستمبر کو برطانیہ، کینیڈا، فرانس اور کچھ اور ممالک نے عمل درآمد کی صورت میں اسرائیل پر پابندیاں لگانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ مغربی کنارے کے سیکٹر ای۔ ون میں شامل علاقہ ہے۔ پابندیوں کا ممکنہ اعلان کرنے والے ممالک نے کہا ہے کہ وہ مغربی کنارے میں تعمیر شدہ، زیر توسیع یا زیر تعمیر بستیوں میں تیار ہونے والی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں گی۔

18 اگست کو اسرائیل نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایریا E-1 میں 1,234 ہاؤسنگ یونٹس تعمیر کرے گا۔ ان میں اسرائیلی یہودیوں کو لا کر آباد کیا جائے گا۔ یہ اعلان اسرائیلی وزارت تعمیرات و ہاؤسنگ نے کیا تھا۔ اس کی نگرانی فاشسٹ وزیر خزانہ بزازیل سموٹریش کر رہے ہیں۔

سیکٹر E-1 ایریا E-1 کا منصوبہ سابق اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن نے 1994ء میں بنایا تھا۔ لیکن اس کی شدید عالمی مخالفت کی وجہ سے اس پر عمل درآمد اب تک نہیں ہو سکا۔ یہ منصوبہ مجوزہ فلسطینی ریاست کے قیام کو ناممکن بنانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ تب اس کی تعمیر کے لیے درکار فنڈز بھی موجود نہیں تھے۔

اب جو ٹینڈر جاری کیا گیا ہے، ماضی کے منصوبے سے انحراف قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کا انکشاف فلسطین کی منصوبہ بندی اتھارٹی اور نوآبادیاتی دیوار کی مزاحمت کرنے والے کمیشن کے سربراہ عامر داؤد نے کمیشن کی دستاویزات میں حال ہی میں کیا ہے۔ اس انکشاف کا مقصد فلسطینی سرزمین پر اسرائیل کے قبضے کو روکنا ہے۔

اس پلان کی مذمت کرنے والی حکومتوں اور فلسطینی اداروں نے اسرائیل کے اب تک کے تعمیراتی منصوبوں میں سے اسے سب سے خطرناک قرار دیا ہے۔ عامر داؤد کا کہنا ہے کہ یہ منصوبہ یہودی آبادی کے بڑے منصوبوں میں سے سب سے بڑا ہے۔

اسرائیل کی حمایت کرنے والے اور دیگر 30 امریکی سینیٹرز نے 28 اگست کو ایک مشترکہ خط جاری کیا۔ اس خط کے ذریعے صہیونی حکومت پر زور دیا گیا تھا کہ ایریا E-1 میں اپنے مجوزہ منصوبوں کو ترک کرے اور جتنی جلد ہو سکے اپنا ٹینڈر واپس لے۔

اس خط کے جاری ہونے کے دو دن بعد 30 اگست کو برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ،

کینیڈا، ناروے، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، سویڈن، بلجیئم، سپین، آسٹریا، یونان، قبرص، فن لینڈ اور یورپی کمیشن نے بھی اسی نوعیت اور نفس مضمون کا خط جاری کیا اور بیانات بھی دیے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا منصوبہ جاری رہا تو اسرائیل بین الاقوامی طور پر مزید تنہا ہو جائے گا۔

اسرائیل نے ان بیانات اور مذمت کو کسی اہمیت کے قابل بھی نہیں سمجھا اور نظرانداز کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو انہی ممالک کی طرف سے مذمت ایک انڈرسٹینڈنگ کی ''بدولت'' درخور اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نسل کشی کے دوران میں ان میں سے زیادہ تر ممالک اسرائیل کو فوجی امداد بھی دیتے رہے اور اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے مذمت بھی کرتے رہے۔ سفارتی زبان میں ہلکی سی یا بے اثر مذمت کے لیے Diplore کا لفظ بولا جاتا ہے۔ واقعی مذمت کرنا ہو تب Condemn کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایک تیسرا درجہ بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ ان میں درمیانی راستہ یہ ہے کہ پابندیاں لگانے کی محض دھمکی دی جاتی ہے۔ اسرائیل ان تمام کا عادی مجرم ہے۔

جبل البابہ فلسطینی گاؤں کے ایک ترجمان اعلیٰ مظارہ کہتے ہیں کہ اس کے گاؤں کے 450 رہائیشیوں کو بے دخلی کا عملی سامنا ہے۔ وہ اس کالونی کی وجہ سے زیرعتاب ہیں اور اسرائیلی نوآبادیات کے اولین ہدف قرار دیے جا رہے ہیں۔ البابہ کے ترجمان کا کہنا ہے کہ ان تمام ممالک کے بیانات کا ذرہ بھر اثر زمین پر نظر نہیں آ رہا۔

منصوبہ کیا ہے؟:۔

E-1 دراصل ایسٹ ون (East One) کا مختصر نام ہے۔ یہ ایک نئ اسرائیلی کالونی بننے جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں کہتی ہیں کہ اسرائیل کے اقدامات غیرقانونی ہوں گے۔ E-1 کو عبرانی زبان میں Mevaserat Admonim کہا جاتا ہے۔ یہ کالونی پہلے سے موجود کالونی Maala Admonim کے درمیان بنائی جا رہی ہے۔ یہ مغربی کنارے میں رقبے کے اعتبار سے سب سے بڑی یہودی بستی ہوگی۔ یہ مقبوضہ بیت المقدس کا رقبہ ہے۔ یہ مکمل ہونے کی صورت میں اناطہ، الزایام، الاہزاریہ اور ابودس کے ساتھ ساتھ اللسوایہ دیہات پر مشتمل مغربی کنارے کی سب سے بڑی کالونی ہوگی۔ اس کالونی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے اسرائیلی حکومت ایک مستقل اور مسلسل یہودی آبادکاری بیلٹ بنائے گی۔ اس طرح یہ آسانی سے ماعالا گاؤں یا کالونی کے قریب سے گزرے گی جہاں پہلے ہی 40,000 اسرائیلی آباد کیے گئے ہیں۔

جہاں یہ کالونی E-1 بنائی جا رہی ہے، وہاں 7000 فلسطینی رہتے ہیں۔ ان کو زبردستی بے دخل کر دیا جائے گا۔ ان کو ان کی زمینوں سے نکال دیا جائے گا۔ اسرائیل نے پہلے سے ہی ان علاقوں میں فلسطینیوں کے گھر تباہ کرنے، بلڈوز کرنے یا بم سے اڑانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج اسرائیل کی مذمت کرنے والے ممالک کو پہلے سے علم تھا کہ یہ کالونی بن کے رہے گی۔ مشرقی مقبوضہ بیت المقدس کے سربراہ باسم بہار نے یہ تفصیلات میڈیا کو بتائی ہیں۔

یہ کالونی، جیسا کہ ذکر ہوا، مقبوضہ بیت المقدس میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ یہ تاریخی شاہراہ کے ساتھ ساتھ بن رہی ہے جو مقبوضہ بیت المقدس کو جیریکو شہر سے ملاتی ہے۔ یہ سارا مشرق کی سمت کا علاقہ ہے۔ یہ فلسطینیوں کے لیے تباہ کن منصوبہ ہے۔ یہاں سے 2009ء سے 9000 فلسطینی بے دخل کیے جا چکے ہیں۔ ان کے گھربار اور کاروبار برباد کیے جا چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے 500 مکانات گرائے جا چکے ہیں۔

E-1 منصوبہ فلسطینیوں سے ایسی زمین چھین رہا ہے جو ان کی ترقی، معاشی حالات میں مثبت تبدیلی اور مغربی کنارے کی ارضیاتی وحدت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس ارضیاتی وحدت کے اردگرد بڑے بڑے رقبے خالی چھوڑے گئے ہیں۔ ان میں مزید یہودی آبادکاری کے منصوبے مرحلہ وار مکمل کیے جائیں گے۔

دوسرا اثر یہ ہے کہ اس کے مکمل ہونے کے بعد مقبوضہ بیت المقدس پہلے سے قائم اسرائیلی آبادی اور گھروں کے مکمل گھیرے میں آ جائے گا۔ اس طرح یہ شمال اور جنوب تک پھیلی ہوئی اسرائیلی کالونی بن جائے گی۔ یہاں سے روزانہ یہودیوں کی آزادانہ نقل حمل، تجارت اور ترقی کی راہیں مزید کشادہ ہو جائیں گی۔

تیسرا اثر یہ ہوگا کہ یہ کالونی مغربی کنارے کی علاقائی وحدت کو توڑ دے گی جس سے کسی بھی فلسطینی ریاست کے قیام کا امکان بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے Maaleh کی یہودی بستی براہ راست یروشلم سے جا ملے گی۔ اس سے مقبوضہ بیت المقدس اور مغربی کنارے کے فلسطینی مستقل طور پر ایک دوسرے سے جدا کر دیے جائیں گے۔ یہاں یہودی بستیوں کا نیا نیٹ ورک آسانی سے بنا دیا جائے گا۔

یہ نیٹ ورک وادیٔ اردن اور اس سے ملحقہ علاقوں کی سمت پھیلتا چلا جائے گا۔

نئی لیکن جبری شہر سازی:۔

قبضہ ہمیشہ ناجائز اور لاقانونی ہوتا ہے۔ ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کم از کم سو جھوٹ مزید بولنا پڑتے ہیں۔ قبضہ تسلیم کرانے کے لیے ہزار افراد کی جانیں لی جاتی ہیں تو اسے برقرار رکھنے کے لیے دس لاکھ جانیں لینا پڑتی ہیں۔ برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ تک، امریکہ کے ریڈ انڈینز سے لے کر برطانوی امریکیوں تک اور پھر آسٹرو ہنگرین ایمپائر، یوگوسلاویہ کی جگہ سربیا اور پاکستان سے بنگلہ دیش برآمد کرنے تک، عراق ولیبیا و کویت، یمن و بحرین تک پھر لاکھوں زندگیاں کیا ہوئیں، کس نے کیں، کیسے کیں؟

اب یہ تجربہ فلسطین میں سٹیج کیا جارہا ہے۔ دنیا کے معاملات میں منصفی کا ''منصب'' سنبھالنے والے امریکہ کے صدر نے کیا کچھ نہیں کیا اور کردار یہ تھا کہ ایک واٹر گیٹ سے نکلا اور ایک کے کمرے سے مونیا لیونسکی کی تار تار آبرو برآمد ہوئی، پھر بھی سرکاری اعزاز سب کو دیا گیا۔ اب بش جونیئر اور سینئر، جو بائیڈن اور ڈونلڈ ٹرمپ کو بھی مل جائے گا۔ قبروں میں ٹانگیں لٹکائے ان بوڑھوں نے کروڑوں انسان اجتماعی قبروں میں صرف اس لیے منتقل کردیے تاکہ تیل کے ڈالر قبضے میں رہیں، مسلمانوں کے مراکز پر قبضہ رہے اور

کعبے کو مل گئے پاسباں حرم سے

کے مصداق عالم اسلام میں بھی رنگیلے بہت تھے۔ ایلیسٹین کے ہاں سے ان کا بھی بہت حجم برآمد ہوا اور سزا عالم اسلام کو ملتی رہی۔ اب یہی کام اسرائیل لبنان و شام اور اردن و امارات کے حکمرانوں اور شیوخ سے کررہا ہے۔ کس مسلم ملک نے مغربی کنارے میں ہونے والے واقعات کی مذمت تک بھی کی؟ اہل مغرب پھر بھلے بن رہے ہیں کہ کم از کم مذمت تو کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کریں گے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مقبوضہ مغربی کنارے میں فلسطینیوں کے خلاف غزہ سے بھی زیادہ خطرناک نسل کشی کے حملے ہوں گے۔ ان کی عمارتیں ہی نہیں گرائی جائیں گی بل کہ انہیں براہ راست نسل کشی کا ہدف بنایا جائے گا۔ ان مغربی ممالک کی یہ تنقید ظاہر کررہی ہے کہ ہونے کیا جارہا ہے۔

فلسطینیوں کے لیے اس منصوبے کے کیا دوررس جغرافیائی، ارضیاتی اور سیاسی نتائج ہوں گے، وہ بہت بھیانک اور خطرناک ہوں گے۔ اس کا سیاسی ہدف اولین فلسطینی آبادی کی جبری ہجرت ہی نہیں بل کہ مکمل خاتمہ ہوگا۔ تمام بدو دیہات جبری طور پر سب سے پہلے ایریا E-1 سے ہجرت پر مجبور کردیے جائیں گے۔ ان علاقوں کے نمائندہ مظارا کا کہنا ہے کہ ہم اپنے بدو دیہات سے محروم کردیے جائیں گے۔ ان کا طرز زندگی اور ان کی یادیں میراث اور ثقافت تک مٹا دیے جائیں گے۔ ہر وہ سرمایہ جو ہم نے اور ہمارے اجداد نے ہمیں منتقل کیا ہے اور ہم نے اسے اب تک محفوظ رکھا ہوا ہے، وہ سب حرف غلط کی طرح اسی طرز پر مٹا دیے جائیں گے جس طرح لائیو سٹاک اور پولٹری میں کسی ناقابل علاج بیماری کی وجہ سے یا تو ذبح کردیا جاتا یا گولی ماردی جاتی ہے۔ اسرائیل کے لیے ہر فلسطینی بذات خود بیماری ہے۔ منصوبہ تو ان تمام بیماریوں کو مٹا دینے کا ہے، خواہ وہ ذبح کیے جائیں یا انہیں گولی ماردی جائے۔

جنوری 2023ء سے 31 اگست 2026ء کے درمیانی عرصہ میں اس ایریا سے 130 فلسطینی دیہات یا تو مکمل یا جزوی طور پر مٹا دیے گئے ہیں۔ آبادی کو زبردستی بے گھر اور بے دخل کردیا گیا ہے۔ ان کی معیشت اور تجارت تباہ کردی گئی ہے۔ ان پر آبادکار یہودیوں کے غول در غول فوج اور پولیس کی مدد سے حملے کیے گئے ہیں۔ غزہ میں جاری نسل کشی پر دنیا کی نگاہیں تھیں، اس لیے ان دیہات میں ہونے والی نسل کشی بڑی حد تک اوجھل رہی لیکن انہیں مغربی ممالک کا اسلحہ اور امریکی اشیر باد حاصل رہی۔ یہاں کے فلسطینیوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی گئیں، ان پر ایک جبری نکبہ مسلط کیا گیا۔ ان فلسطینیوں کو اسی طرح سے ہانکا گیا جس طرح گائے، بھینس اور بکریوں کے ریوڑ ہانکے جاتے ہیں۔ ان میں سے جن دیہات میں لائیو سٹاک اور ہسبنڈری کا کام ہوتا تھا، انہیں خصوصی طور پر ہانکا گیا۔ اس طرح سے 48 دیہات صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ بلڈوزر پھیر کر وہاں کی زمین ہموار کردی گئی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے اور اسرائیل کے سرکاری اعداد و شمار کو ہی لے لیا جائے تو 5400 فلسطینی، جن میں 3,100 معصوم بچے شامل تھے، سب کو بے گھر اور بے دخل کردیا گیا۔ صرف 2026ء میں اب تک مزید 2,500 سے زیادہ لوگ، جن میں 1,200 بچے ہیں، زبردستی ان کے گھروں اور زمینوں سے نکال دیے گئے۔

ان دیہات کے دور دراز حصوں میں فلسطین بدو بالکل منفرد طرز زندگی کے حامل رہے ہیں۔ یہ بڑے بڑے شہری علاقوں سے الگ تھلگ رہتے رہے ہیں۔ جب ان کے خلاف آبادکار یہودی اور قابض فوج حملہ آور ہوئی تو یہی الگ تھلگ ان کو آسان شکار بناتا گیا۔ جب کہ اس ایریا کے فلسطینی سربراہ مظارا کا کہنا ہے کہ ہم فلسطینی معاشرت کا جزو لاینفک ہیں۔ ہم فلسطینی ثقافت اور معیشت میں حصہ ڈال کر اسے سخت سے سخت تر مزاحمت کے قابل بناتے ہیں۔ ہم فلسطینی معاشرتی تنوع کی علامت ہیں اور رہیں گے۔ ابھی تک ہمارے یہ 48 دیہات بالکل ختم کردیے گئے ہیں، ہم پر بلڈوزر چلا دیے گئے ہیں۔ دنیا، عالم اسلام، عرب ممالک کیوں ہمارا تماشا دیکھتے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 1990ء تک ہم 3500 سے 4000 لائیو سٹاک پیدا کرتے تھے جو 2026ء میں کم ہو کر صرف 1000 سے بھی کم رہ گیا ہے۔ اس صورت حال نے خوراک کا بحران پیدا کردیا ہے۔

ان تمام اسرائیلی اقدامات کا مقصد فلسطینی آبادی کا مکمل صفایا کر کے اسرائیلیوں کے لیے نئے شہر تعمیر کرنا ہے۔ ایران کے حملوں نے پہلے شہروں کو آئندہ دس سال تک دوبارہ آباد ہونے سے روک دیا ہے۔ یہاں سے نکالے جانے والے فلسطینیوں کو چھوٹے چھوٹے کنسٹریشن کیمپوں میں منتقل کیا جارہا ہے جہاں سے باہر نکلنا لوہے کی تاروں کی حدود بنا کر ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ بڑے بڑے آہنی پنجرے ہیں جن پر اسرائیلی فوج کا محاصرہ ہے۔

مظارا کا کہنا ہے کہ ان کی پیدائش، پرورش اور تعلیم بڑے بڑے شہروں میں نہیں ہوئی۔ اب میں اپنے ہی لوگوں کے درمیان ایک پناہ گزین بن کر رہنے پر مجبور کردیا گیا ہوں۔ یہ کارروائیاں صرف بدو دیہات تک محدود نہیں رہی ہیں۔ حالیہ برسوں میں اسرائیل میں آنے والے یہودی آبادکار اور فوج شہروں پر بھی حملے کرتے رہے ہیں۔ وہ بڑے پیمانے پر فائرنگ کرتے رہتے ہیں۔ مرنے والے فلسطینیوں کی درست تعداد بھی معلوم نہیں ہو پاتی۔ گھر تباہ کیے جاتے ہیں، ان کا طویل محاصرہ کیا جاتا ہے، خواتین کو ہراساں کیا جاتا ہے اور قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ فلسطینیوں سے ان کی زرعی اراضی چھینی جاتی ہے۔ کھڑی فصلیں نذر آتش کردی جاتی ہیں۔

مظاہرا کا کہنا ہے کہ وہ ہماری ہر چیز، ہر ملکیت برباد کررہے ہیں، وہ ہماری مزاحمت ختم کرنے کے لیے کتوں کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں، ہمارے زندہ رہنے کے ہر امکان کو ختم کررہے ہیں۔ ان اقدامات سے ایریا E-1 میں نئی شہر سازی کی جارہی ہے۔

داستانِ اَلم: ربیٰ میسون

صہیونی عقوبت خانوں سے نالۂ زنجیر

فلسطینی قیدیوں پر ہوتے روح فرسا مظالم اور ظلم وستم کی خوفناک داستانیں

زیرِنظر تحریر میں صیہونی زندانوں اور عقوبت خانوں کے اندر نہتے فلسطینی قیدیوں پر ڈھائے جانے والے اس ہولناک اور روح فرسا تشدد کی داستانِ الم ناک بیان کی گئی ہے، جو اکیسویں صدی کے نام نہاد مہذب معاشرے اور عالمی اداروں کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے۔ یہ مضمون نہ صرف قابض ریاست کی فاشسٹ پالیسیوں، ریاستی دہشت گردی اور انسانی حقوق کی کھلم کھلا پامالی کا پردہ فاش کرتا ہے، بلکہ ان مظلوم قیدیوں کی درد بھری چیخوں، فاقہ کشی، جنسی و جسمانی درندگی اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کی وہ سچی تصویر پیش کرتا ہے جو انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

اقتدار کا نشہ، صیہونی تکبر اور ریاستی دہشت گردی

جب 29 دسمبر 2022 کو انسان دشمن صہیونی مجرموں پر مشتمل 37ویں اسرائیلی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو وہ اسرائیلی تاریخ کی سب سے انتہا پسند، فاشسٹ اور سفاک حکومت ثابت ہوئی۔ اقتدار میں آتے ہی اس نے فلسطینیوں کی منظم نسل کشی اور قیدیوں پر بے پناہ مظالم میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ صیہونی کابینہ کے وزراء سرعام اس درندگی کی تائید کرتے ہیں چنانچہ اسرائیلی وزیر نے دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ اپنے بیان میں کہا کہ:

’’اور میں کہتا ہوں، میری رائے میں اُنہیں سر میں گولی مار کر قتل کر دینا چاہیے، دہشت گردوں کے لیے سزائے موت کا قانون نافذ کرنا چاہیے اور ’عوتسما یہودیت‘ کے اس قانونی بل کو تیسری خواندگی میں پاس کروانا چاہیے۔‘‘

اعلیٰ حکام کی جانب سے قتل اور سزائے موت کے اس کھلم کھلا پرچار نے صیہونی جیلوں کو وحشی جلادوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ 19 فروری 2024 کو اقوام متحدہ کے ماہرین نے بھی ان انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں پر، بالخصوص صیہونی حراست میں خواتین کے خلاف ہونے والی لرزہ خیز جنسی زیادتیوں پر اپنے گہرے صدمے اور تشویش کا اظہار کیا۔ اعداد وشمار گواہ ہیں کہ 7 اکتوبر 2023 کے بعد سے اب تک تشدد اور طبی غفلت کے نتیجے میں 18 قیدیوں کے جاں بحق ہونے کا سرکاری سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، عبرانی میڈیا کی اندرونی تحقیقاتی صحافت کے مطابق کم از کم 27 قیدی ایسے ہیں جو وحشیانہ تشدد کے باعث شہید ہوئے لیکن جن کے بارے میں مقتدر حلقوں نے باضابطہ طور پر کوئی اعلان نہیں کیا۔

آہنی بوٹوں تلے روندتی انسانیت اور جسمانی عذاب

اسیران کو صیہونی عقوبت خانوں کے اندر پہنچاتے ہی قیدیوں پر ظلم کے وہ پہاڑ توڑے

جاتے ہیں جن کے تصور سے بھی روح کو کانپ اٹھتی ہے۔ گرفتاری کے ابتدائی لمحات سے ہی ان پر ہتھکنڈے شروع ہوجاتے ہیں۔ ایک نہتے قیدی ان ہولناک لمحات کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ:

''صہیونی وحشی جلاد نے کہا کہ چلو، پُرسکون رہو، پرسکون رہو... زمین پر لیٹے رہو، پیٹ کے بل لیٹے رہو...''

اور پھر جب ایک مظلوم قیدی پر درندے ٹوٹ پڑتے ہیں تو اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیا جاتا ہے۔ ایک متاثرہ قیدی اپنی ہولناک روداد سناتے ہوئے کہتا ہے:

''یہ سب یہودیوں کے فوجی بوٹوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ بوٹ عام بوٹوں سے مختلف ہوتے ہیں، یہ لوہے کے بوٹ ہوتے ہیں۔ جب ان کی ضرب لگتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ہتھوڑا پڑا ہو۔''

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے چہرے پر جو زخم ہیں وہ ان ہی بوٹوں سے ہوئے، تو اس نے روتے ہوئے تصدیق کی۔

''ہاں یہ سب کچھ ان کے فوجی بوٹوں سے ہوا ہے۔ جب میں لیٹا ہوا تھا، پیٹ کے بل پڑا تھا تو انہوں نے میرے چہرے پر بوٹ برسانے شروع کر دیے، میرے چہرے پر مارے اور مجھے روندڈالا اور میری پیٹھ پر بھی، اس نے اپنا بوٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے، میں کیا کرتا... میں نے اس سے کہا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا، تو اس نے کہا کہ مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ دھیان دو آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ جب اس نے میری آنکھ پر بوٹ مارا تو آنکھ ضائع ہوگئی۔ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بس آنکھ چلی گئی ہے۔ ایک آنکھ بالکل بند ہوچکی تھی، پھر جب میں یہاں آ رہا تھا تو راستے میں جا کر کھلی۔''

اسی طرح ایک اور قیدی نے اپنی اسیری کے طویل اور تاریک ایام کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''ہمیں 26 دن تک باندھ کر اور آنکھوں پر پٹیاں چڑھا کر رکھا گیا، ہم نے سورج کی روشنی تک نہیں دیکھی۔ دن رات مسلسل مار پیٹ ہوتی تھی۔ وہ کہتا ہے 'تم حماس ہو' اور بس مارتا ہے، مارتا ہے، مارتا ہی چلا جاتا ہے...''

فاقہ کشی، سردی اور نیند کی محرومی

صیہونی زندانوں میں بھوک اور پیاس کو قیدیوں کے خلاف ایک خاموش ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ انسانیت سوز سلوک کی انتہا یہ ہے کہ مہینوں گزر جانے کے باوجود ان پر کھانے اور پانی کے دروازے بند رکھے جاتے ہیں۔ ایک قیدی اس کرب کو بیان کرتے ہوئے سسک پڑتا ہے۔

''وہ میری لاش پر ناچے... بہت سی بیماریاں ہیں اور وہ ہمیں کھانا نہیں دیتے... ہم نو مہینوں سے بھوکے ہیں، پانی کا ایک قطرہ تک نہیں ہے... وہ ہمیں نہانے نہیں دیتے... وہ ہمیں مارتے پیٹتے ہیں...''

تشدد کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا بلکہ موسم کی شدت کو بھی قیدیوں کے لیے عذاب بنا دیا جاتا ہے۔ شدید ترین سردی میں ان کے تن سے کپڑے اتار کر انہیں برہنہ کر دیا جاتا ہے اور پھر کڑاکے کی اس یخ بستہ رات میں ان پر ٹھنڈا پانی انڈیلا جاتا ہے۔ نیند اور خوراک کی محرومی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ قیدی بتاتے ہیں۔

''تین دن گزر گئے، ہم نے نیند دیکھی نہ کھانا دیکھا اور نہ پانی دیکھا...''

ایک اور قیدی اس لامتناہی عذاب کا ذکر کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا ہے اور کہا کہ ہے۔

''میں آپ کو عذاب کے بارے میں کیا بتاؤں؟ ہر طرح کا ایسا عذاب تھا جو عقل سے باہر تھا... ہمیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں جائیں...''

اجتماعی حراست، تذلیل اور بے حرمتی کی گھناؤنی داستان

صیہونی غاصبوں نے اجتماعی حراست کے نام پر عام شہریوں کو نشانہ بنانے کا قبیح سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خواتین اور بچوں سمیت بے شمار افراد کو اس جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورتحال کو بیان کرتے ہوئے ایک خاتون اسپیکر کہتی ہیں:

''بے شمار مردوں کو پکڑ کر جمع کیا گیا، ان کے کپڑے اتروائے گئے، آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔ ان سب پر حماس کا رکن ہونے کا الزام لگایا گیا۔ جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان میں سے درجنوں افراد کو بار بار سرِ عام نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ بعد میں رہا ہونے والے بعض افراد نے بتایا کہ ان کی بے گناہی کے باوجود ان کے ساتھ کس قدر ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا گیا۔''

جیلوں کے اندر عزتِ نفس کا جنازہ نکالنا صیہونی فوجیوں کا روز کا معمول اور دلپسند مشغلہ ہے۔ عمر کے کسی لحاظ کے بغیر بزرگوں اور کمزوروں تک کو توہین آمیز تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایک قیدی اس ذلت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''وہاں عزت نام کی کوئی چیز نہیں تھی... ہمیں شدید ذلیل کیا گیا... میرے بیٹے ہمیں بہت ذلیل کیا گیا اور ایک خاتون فوجی آ کر 72 سال کی عمر کے ایک بزرگ آدمی کو پیٹتی ہے...''

درندگی ایسی حیوان بھی شرما جائیں

صیہونی عقوبت خانوں کے اندر اخلاقیات اور انسانیت کی تمام حدود اس وقت پامال ہو جاتی ہیں جب وہ قیدیوں پر جانوروں کو چھوڑتے ہیں اور حیوانیت کا ایسا مظاہرہ کرتے ہیں جسے سن کر کلیجہ منہ کو آ جائے۔ اس ہولناک ترین واقعے کی گواہی دیتے ہوئے ایک قیدی اپنے دل پر پتھر رکھ کر بتاتا ہے:

''اس لمحے وہ ہم تینوں میں سے ایک نوجوان کو لے گئے، کنکریٹ کے فرش پر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے اور اس پر کتا چھوڑ دیا۔ اس کتے نے اس کے ساتھ پوری طرح سے جنسی زیادتی کی۔ یہ لمحہ میری زندگی کے ان سب سے تلخ اور کٹھن لمحات میں سے تھا جو میں نے جیے ہیں۔''

یہ تمام ہولناک شواہد اور چیخ و پکار اس تلخ حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ صیہونی زندان دراصل انسانیت کے قبرستان ہیں جہاں روزانہ قانون، اخلاق اور بین الاقوامی معاہدوں کا خون کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے انسانی حقوق کے اداروں اور نام نہاد عالمی ضمیر کے لیے یہ ایک کھلا سوالیہ نشان ہے کہ وہ اس ریاستی دہشت گردی پر مجرمانہ خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ظلم کی یہ تاریک رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، نہتے فلسطینی قیدیوں اور اس غیور قوم کا پختہ عزم، استقامت اور حریت پسندی کا یہ سفر صیہونی فاشزم کو ایک دن ضرور ملیامیٹ کر کے رہے گا۔

براہ راست رپورٹ: سعود الصباحی

بحیرہ روم کے اس پار سے غزہ کیسا لگتا تھا

شام کی خاموشی میں جب ہاسٹل یا کیفے کی کھڑکی سے سمندر کا افق سرخ دکھائی دیتا ہے، تو فاصلے مٹ جاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں اپنے وطن کی سرزمین پر گرتے بموں کی گونج سے جڑ جاتی ہیں۔ 7 اکتوبر 2023ء کے بعد جب اسرائیل نے غزہ پر ہلاکت خیز جنگ مسلط کی، تو اس کی آگ صرف غزہ کی گلیوں تک محدود نہ رہی، بل کہ دیارِ غیر میں بیٹھے ہر فلسطینی کے وجود کو جھلسانے لگی۔ ترکی کے شہر اناطولیہ میں سکالرشپ پر تعلیم حاصل کرنے والی ایک طالبہ کے لیے، جس کی دن کی صبح کتابوں کے ساتھ اور رات کا وقت کیفے میں کافی کے گلاس صاف کرتے گزرتا تھا، یہ جنگ محض ایک خبر نہیں تھی بلکہ اپنے پیاروں، اپنے خوابوں اور اپنی روح کے روزانہ قتل ہونے کا ایک نا ختم ہونے والا صدمہ تھی۔ یہ کہانی ایک ایسی ہی دوشیزہ کی زبانی ہے، جس نے دیارِ غیر میں تنہائی اور احساسِ جرم کے ساتھ اپنے خاندان کی سلامتی اور غزہ میں موت سے نبرد آزما اپنی دوست، ڈاکٹر مریم، کی چیخوں کو سُنا۔

جب اسرائیل نے اکتوبر 2023ء میں غزہ پر جنگ مسلط کی اور حملوں کا آغاز کیا تو میں ترکی کے شہر اناطولیہ میں ایک کافی شاپ پر کام کرتی تھی۔ دن کے اوقات میں سکالرشپ پر میں طالب علم تھی۔ شام کے اوقات سے لے کر رات گئے تک میں کافی گاہکوں کو پیش کرتی۔ کاغذی گلاسوں میں کافی پیش کی جاتی۔ میں میز اور کرسیاں سیدھی کرتی، میزوں پر گری کافی صاف کرتی جو بعض اوقات میرے ہاتھ جلا ڈالتی تھی۔ ادھر بحیرۂ ابیض کے پاس جسے جدید دنیا بحیرۂ روم کہتی ہے، اسرائیل کے جنگی طیارے نہتے فلسطینیوں کو ان کے گھروں پر میزائیل اور بم گرا کر مارتی تھی۔

میں اناطولیہ میں دو سال سے تھی۔ سکالرشپ سے بہ مشکل فیس ادا ہو پاتی تھی۔ گھر والے مجھے کچھ نہ کچھ رقم ارسال کیا کرتے تھے۔ اسرائیلی حملوں کا مجھ پر پہلا اثر منفی تھا۔ گھر سے مالی معاونت یکسر بند ہو گئی تھی۔ وہاں سے رقم کا آنا ممکن نہ رہا تھا۔ میں اپنے سر پر میسر چھت برقرار رکھنے کے لیے کافی شاپ پر کام کرتی۔ یونیورسٹی کلاسز دن میں ہوتیں۔ دوپہر سے شام پڑھے ہوئے دوہرانے اور شام سے رات کافی شاپ پر ویٹر کے طور پر گزرتی۔ گنتی کے چند گھنٹے آرام ملتا۔ میرے ویک اینڈ بہت سخت ہوتے۔ گیارہ گھنٹے کام کرتی۔

میرے سامنے کافی سے بھرے میز ہوتے جو میں کپڑے سے صاف کرتی اور پھر وہ کپڑا کندھے پر لگائے گاہکوں کی آوازوں پر دوڑنے میں چشم تصور میں عمارتیں گرتے دیکھتی، چیخوں اور درد و الم انگیز آواز میں کافی کے ہر ڈسپوزیبل گلاس کی طرح کہیں گم ہو جاتیں۔ پھر نئی چیخیں اور نئی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔

گھر پر میرے والد بھی کافی کا روسٹ بنایا کرتے تھے۔ جب کافی تیار ہو جاتی تو پہلے

مجھے کہتے: چکھو، پیو اور پھر بتاؤ کیسی بنی ہے؟ میں اسی میں بڑی ہوتی گئی کہ اچھی کافی کیا ہوتی ہے، کیسے بنائی جاتی ہے وغیرہ۔ اس کافی سے اٹھنے والی سٹیم ہی دیکھتی، ذائقہ میں کیا خاک بتا پاتی۔

میں دودھ کاڑھتی رہتی کئی مرتبہ وہ ابل پڑتا۔ میں کافی کے کپ تیار کرتی۔ میں بہت پریشان بھی ہوتی۔ کسٹمرز کی آگ برساتی آنکھیں، دیر ہونے کا شکوہ۔

کیفے کا مالک محمود بے مجھے ایک ناکام ویٹر نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا کہ تم ایک نوجوان فلسطینی ہو جو مستقبل بنانے کے ارادے سے نکلی ہے۔ مجھے تجربہ آہستہ آہستہ حاصل ہو رہا تھا۔ میں ہر مرتبہ سوچتی کہ مزید بہتر طریقے سے کافی کیسے بنائی اور کسٹمرز کو پیش کی جاتی ہے۔ اندھیرے دور دور کیوں کر ہوں گے۔ میں اپنے بدن کو مزید مشقت کا عادی بناتی جاتی۔ یہی ایک طریقہ اور راستہ تھا جس سے میں اپنے سر پر چھت برقرار رکھ پاتی۔ میں اپنے آپ کو بہت روکتی کہ مجھے بحیرۂ ابیض کے پار نہیں دیکھنا اور نہ سوچنا ہے۔ میں جمے ہوئے سمندر کی طرف دیکھے بنا رہ نہیں پاتی تھی۔ افق خون آلود نظر آتا۔ میں براہ راست غزہ پر گرے بم محسوس کرتی۔ مجھے اپنے اہل خانہ یاد آتے۔ دوست نگاہوں میں گھومتے رہتے۔ یہ 14 اکتوبر 2023ء کا دن تھا۔ میری سال گرہ کا دن، میرا یوم پیدائش۔ رات کے دس بجے ہوں گے، میرے ایپرن کے نیچے سے میرا فون بار بار چیخ اٹھتا۔ پیغامات آ رہے تھے۔ مبارک، مبارک، سال گرہ مبارک۔

پھر مجھے ٹیلی گرام موصول ہوا۔ اس میں شہید ہو جانے والے پیاروں کے نام درج تھے۔ میں دیوانہ وار ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا اور پھر۔۔۔ نام کے نام تھے۔ کسے روتی اور کسے چھوڑتی۔ پھر میں نے کانپتے ہاتھوں سے فہرست کو پھر سے دیکھا۔ میرے ابو، میری امی۔۔۔

کیفے کے ٹی وی پر ایک خبر اچانک گردش کرنے لگی۔ رفاہ میں میرے گھر کے برابر کا گھر اب گھر نہیں رہا تھا، ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ میزائیل نے اسے اڑا کے رکھ دیا تھا۔ سارے غزہ میں یہی کچھ تھا۔ کیا شمال اور کیا جنوب! غزہ سٹی برباد ہو رہا تھا اور نہ جانے کیا بنا خان یونس کا، اور ہاں! جبالیہ پر بھی قہر ٹوٹا تھا۔ جنوبی غزہ پر بمباری کی خبر ابھی آئی تھی۔ پورے غزہ کا یہی منظر تھا۔ خواہ وہ کوئی اپارٹمنٹ تھا یا بڑی بلڈنگ، کئی خاندانوں کی رہائش گاہ یا پھر دفاتر کی آماج گاہ۔ چند راکٹ، چند میزائیل گرتے اور۔۔۔ گھروں کی کھڑکیاں، شیشے اور پھر دیواریں ٹوٹ گرتیں۔ صرف ایک گھر آگے والا مکان گرتا اور تباہی اردگرد کا بھی مقدر بن جاتی۔

کیفے سے رات گئے فارغ ہو کر یونیورسٹی ہاسٹل کے کمرے میں آئی تو موت کی سی خاموشی کا راج تھا۔ میں سو نہیں سکی۔ میں صبح 6 بجے تک جاگتی رہی۔ بار بار ٹیلی گرام پڑھتی۔ ناموں کو دیکھنا، سوچتی یہ ہو گیا ہو گا، وہ ہو گیا ہو گا۔ پھر سر جھٹک کے زیر لب بولتی، کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ جب 2021ء میں غزہ چھوڑا تھا تب مجھے ریڈیو، ٹی وی اور سینیما جرنلزم پڑھتے سکالرشپ ملا تھا۔ میرے والدین، بہنیں اور تین بھائی غزہ میں ہی تھے۔

پھر صبح فون کی گھنٹی شور کے ساتھ بج اٹھی۔ میری والدہ ایک پرہجوم پناہ گاہ سے بول رہی تھیں۔ رفاہ میں سگنل بہت کمزور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میری ہمشیرہ اور بھائی خیریت سے تھے اور زندہ تھے۔ ہمارا گھر حیرت انگیز طور پر بہت کم متاثر ہوا تھا۔ میرے والد اور دوسرے بھائی بھی زندہ سلامت تھے۔

میں نے سکون کا سانس لیا، ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ لمحہ عارضی تھا۔ پھر ایک فون کال نے مجھے جذباتی اور طبعی دونوں اعتبار سے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک فون کال پھر آئی۔ مجھے غزہ میں اپنے دوستوں کا خیال آیا۔ میں ایک کے بعد دوسرے کو کال کرنے لگی۔ اگرچہ میں بری طرح تھک چکی تھی اور ہانپ رہی تھی۔ میں اس وقت اس فرد کی جرم کے احساس میں ہونے کی کیفیت بھی دیکھ اور محسوس کر رہی تھی جس نے مجھے کہا تھا: آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا!

جرم کے احساس میں: ان میں سب سے پہلا نمبر میری دوست کا تھا۔ مریم اور میں تقریباً ایک سال پہلے ملے تھے۔ تب ہمارا دبئی میں ہونے والے لٹریری پروگرام میں پہلے فلسطینی کے طور پر انتخاب ہوا تھا۔

اس دورے نے ہم دونوں کو باہم قریب کر دیا تھا۔ میں 16 سالہ لڑکی تھی اور میرے ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔ ایک لکھاری بننا میرا خواب تھا۔ مریم ایک ذہین طالبہ تھی۔ اس کی عمر تب 16 سال ہی ہوگی۔ وہ مسکراتی تو اس کے تاثرات سے اعتماد جھلکتا۔ وہ مجھے کہتی تھی کہ وہ ایک سرجن بنے گی۔ ہماری دوستی اب بہت گہری ہو چکی تھی۔ ہم اپنے اپنے مستقبل کے منصوبوں کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہے تھے۔

جنگ کے پہلے ہفتہ میں مجھے احساس جرم نے گھیر لیا تھا۔ میں تو منجمد سی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ غزہ میں تھی اور اسے ایس ایم ایس کرتے بھی میں ڈرنے لگی تھی۔ انا طولیہ ایک مضبوط عمارت سے اسے سلامتی کا پیغام میں کیسے بھیجتی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری رہائش والی عمارت اچانک کیسے ٹوٹ سکتی تھی۔ جب کہ مریم کے گھر کی ہر دیوار کو بم ہلائے دے رہے تھے۔

نومبر 2023ء میں میرا مریم سے رابطہ ممکن ہو سکا تھا جو اب تک جاری ہے۔ مجھے احساس گھیرے رکھتا کہ کس طرح جنگ کی تباہ کاریوں نے مریم کو کہیں دور

اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔

مریم ابھی میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر بننے سے ابھی بہت دور تھی۔ پھر اچانک ہی غزہ میں ہسپتالوں کا نظام تباہی سے دوچار ہوگیا تھا۔ کئی سینیئر ڈاکٹر جان کی بازی ہار گئے تھے۔ اسے بار بار ٹراما سے ڈرے سہمے مریضوں کو دیکھنا پڑتا۔ حالاں کہ اس کی ٹریننگ بھی بہت بعد کی بات تھی۔ وہ روزانہ جاتی اور ہر روز موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے دیکھتی۔ تب تک تقریباً 1700 صحت ملازمین مارے جا چکے تھے۔ یہ اعداد وشمار فلسطین کی وزارت صحت جاری کرتی تھی۔

گھر نہ آنا: وہ مجھے ناصر میڈیکل کامپلیکس سے وائس میسج کر رہی تھی۔ یہ خان یونس کے علاقے میں واقع تھا اور محل وقوع کے اعتبار سے یہ جنوبی غزہ تھا۔ یہ اگست 2024ء کے دن تھے۔ ”میرا خون رگوں میں دوڑنا بھول گیا ہے۔ میں منجمد ہی ہوگئی ہوں۔“ ایک وائس ریکارڈنگ میں اس نے مجھے پیغام دیا تھا۔

میں نے اپنے خاندان تک رابطہ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ اس کے گھر کے پاس فون کے ٹاور نشانہ بن گئے تھے۔ وہاں کئی خاندان ایک اپارٹمنٹ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ جب مریم مجھے وائس پیغام بھیجتی تو اس کی آواز کانپتی صاف محسوس ہوتی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں پناہ لیے محض ایک دو دنوں کے بچے بھی تھے۔ وہ بے یار و مددگار تھے۔ مجھے انہوں نے مریم کے ذریعے ہی بتایا کہ ”ہم کہیں اور جا بھی نہیں سکتے“ پھر وہ لائن بھی خاموش ہوگئی تھی۔ ہسپتال میں پھنسی اور کئی کئی گھنٹے رابطہ نہ ہوسکتا تھا کہ پناہ لینے والے کس حال میں ہوں گے۔ پھر ایک دن مریم کی ماں نے بہت مختصر پیغام دیا۔ ان کی آواز کانپتی۔۔۔ہوئی انہوں نے کہا: ”گھر مت آنا، ہم گلی میں آنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ہسپتال میں ہی رہو۔“ پھر آواز بند ہوگئی۔

مریم نے مجھے بتایا کہ میں انتظار میں رہی کہ ان کی آواز سن سکوں۔ وہ بہت خوف ناک لمحے تھے۔ میں تو چیخ بھی نہیں سکتی تھی حالاں کہ میں بلند آواز میں چیخنا چاہتی تھی۔

جب مریم نے بتایا کہ اس کے خاندان کے افراد زندہ ہیں تو وہ خوشی سے مگر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اس نے خود کو کام میں مصروف کرلیا تھا۔ میں ایک پروسیجر پورا کرتی تو دوسرے کو دیکھنے لگ جاتی۔ مجھے ہر طرف بہتا خون دکھائی دیتا۔ یوں لگتا کہ اب تو آنکھیں بھی خون سے بھری ہوئی ہیں۔ زخم زخم میرے ہم وطن تھے۔ ہر قسم اور ہر طرح کا زخم اسرائیلیوں کی بے رحمی کی یاد بن جاتا تھا۔ پھر مجھے سینئر ڈاکٹروں نے زبردستی آپریشن روم سے نکال دیا تھا۔ ”رات کے اوقات میں سارے کے سارے میڈیکل سٹوڈنٹس جا چکے تھے۔ صرف میں وہاں رہ گئی تھی، میں نے ایک جگہ اپنے لیے صاف کرلی تھی اور میں نے دو راتیں وہیں گزاریں۔“ جب اس کے خاندان نے انروا UNRWA میں پناہ لے لی، مریم گلیوں سے ہوتی ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔

وہاں ہر جگہ گولیوں اور بموں کے سیاہ نشانات پڑے تھے۔ یہ نشان یا دھبے چھتوں پر بھی تھے اور دیواروں پر بھی تھے۔

اسرائیلی توپ خانہ مسلسل گولے برسا رہا تھا۔ یہ گولے ہسپتال کے اطراف میں گرتے رہتے۔ پھر میری روح کا ایک حصہ چلا گیا۔ یہ جون 2025ء کا مہینہ تھا۔ مریم نے میرے ساتھ ایک رات کا واقعہ بیان کیا۔ جب مکمل ناکہ بندی کے بعد ناصر ہسپتال کو۔۔۔مل گئی تھی۔ جوں ہی اس نے مٹھاس سے بھرپور کافی اپنے لیے بنالی، اس نے اپنا فون آن کیا، اسے پیغامات نے درد کی گہری وادی میں پھینک دیا۔ اس کے جس جان سے پیارے انکل اور ان کی ساری فیملی بمباری میں مارے گئے تھے۔ اس کی میتیں ہسپتال کے مردہ خانے میں لاوارث پڑی تھیں۔ یہ وہی ہسپتال تھا جہاں وہ کام کر رہی تھی۔

”میں نے خبریں پڑھیں اور سیدھی اپنے سونے کے کمرے میں چلی آئی۔ اگلی صبح میری والدہ ان پیاروں کو اللہ حافظ کہنے ہسپتال آئیں۔ میں دور سے چلا اٹھی۔ میرے انکل کو مجھ پر اس قدر ناز تھا کہ وہ مجھے کسی اور طرح پکارنے کے بجائے ڈاکٹر مریم کہہ کے بلاتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری روح کا ایک بڑا حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔

”میں جانتی تھی کہ جب ان شہیدوں کو ہسپتال لایا گیا، انہیں سیدھے مردہ خانے لے جایا گیا تھا۔“ لیکن مجھے اپنی ماں کو تسلی اور سہارا دینا تھا۔ انہوں نے میرے سفید کوٹ کو دیکھا جیسے کہ میں ان کی آخری امید تھی۔ دو گھنٹوں بعد میں قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی: ”کیا ہم مردہ خانے چلیں“؟ میں بھول گئی تھی کہ وہ تو مجھے امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ اور وہ اس طرف چل دیں گویا کہ وہ اب بھی امید کی ہلکی سی کرن میری آنکھوں میں تلاش کر رہی تھیں۔“

اناطولیہ میں مریم کی آواز میں یہ ریکارڈنگز سن کر میں نے اپنی سانسیں بحال کرتے ہوئے محمود بے کی طرف دیکھا اور پھر کیفے کی طرف دیکھا گویا کہ میں اسے خالی کر رہی ہوں۔ میں واپس مڑی۔ شاید میں اپنا سکالرشپ ترک کرنے والی تھی اور غزہ جا کر مریم کو وہاں سے نکالنے اور دلاسا دینے کو تھی۔ لیکن ہر لمحہ مجھے لگا کہ میں سب کچھ چھوڑ رہی ہوں۔

”میری موجودہ کیفیت ایسی ہے جیسی اس جنگ نے بنادی ہے۔ مجھے مریم کا پیغام موصول ہوا۔ ”میں ٹھیک نہیں ہوں۔“ ”میں اب وہ مریم ہو ہی نہیں سکتی جیسی کہ میں جنگ سے پہلے تھی۔ میں خود کو مجرم تصور کرتی ہوں۔ میں اب بہت مضمحل ہوں، میں تو اب ایسی اداکاری بھی تو نہیں کر سکتی گویا کہ میں زندہ بچ گئی ہوں۔ اگر کچھ باقی ہے تو میرا یہ وجود ہے۔ میری روح تو مر چکی ہے۔“

مریم جولائی میں ڈاکٹر بن گئی تھی۔ لیکن وہ ذہنی طور پر اپنی لازمی انٹرن شپ نہیں کر سکی۔ اب اس کے پاس ہسپتال کو دینے کے لیے لازمی ٹریننگ فیس بھی نہ تھی۔ وہ اب بھی غزہ میں ڈاکٹر کے طور پر کام کر رہی ہے۔ وہ مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔ وہ غزہ میں داخل ہونے والے میڈیکل وفود کو بریف کرتی ہے۔

اس وقت میں اناطولیہ میں ہوں۔ میرا قلم یہ سب لکھ رہا ہے۔ یہ الفاظ میرے ہیں لیکن خیالات مریم کے ہیں، غزہ کے حالات کے ہیں۔

آج جب میں اناطولیہ کے ساحل پر بیٹھ کر قلم اٹھاتی ہوں، تو یہ الفاظ اگرچہ میرے ہیں لیکن ان میں دھڑکتا ہوا درد مریم کا ہے اور یہ داستان پورے۔ غزہ کی ہے جو ایک ایسا غزہ جو اب ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے، جہاں کے لوگ اپنے ہی پیاروں کی لاشوں کو کاندھا دینے کے بعد زبردستی مسکرانے کی ناکام اداکاری بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے درمیان بحیرۂ روم کا وسیع سمندر حائل ہے، میں اس پار بیٹھ کر صرف آنسو بہا سکتی ہوں اور شہیدوں کی یادوں کو دیکھ سکتی ہوں، جبکہ مریم اس آگ کے سمندر کے بالکل وسط میں کھڑی ہو کر زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس جنگ نے عمارتیں ہی نہیں ڈھائیں، بلکہ زندہ بچ جانے والوں کی روحوں کو بھی ہمیشہ کے لیے زخمی کر دیا ہے۔ لیکن تمام تر ویرانیوں اور احساسِ جرم کے باوجود، مریم کی مسمار نہ ہونے والی ہمت اور میرا یہ قلم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جب تک ایک بھی سانس باقی ہے، غزہ کی سچائی، اس کا درد اور اس کے لوگوں کا صدمہ دنیا کے ہر کونے تک پہنچتا رہے گا۔

غزہ میں تین امریکی ڈاکٹروں نے کیا دیکھا؟

فلسطینیوں کی نسل کشی : انسانیت کی خودکشی

ہم مطالبہ کر رہے تھے کہ غزہ میں کینسر میں مبتلا بچے ہیں جن کا مکمل علاج کیا جا سکتا تھا، وہ اپنے کینسر کی وجہ سے مر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں مقبوضہ مشرقی بیت المقدس (مشرقی یروشلم) کے ہسپتال میں بھی جانے سے روک دیا گیا تھا۔ وہاں المقاصد یا آگسٹا وکٹوریہ ہسپتال تھے جہاں ان بچوں کا علاج ہو سکتا تھا۔ اکتوبر 2023ء سے پہلے ایسے مریضوں کو وہاں لے جانے کا راستہ کھلا تھا۔ لیکن اسرائیلی جان بوجھ کر یہ راستہ بھی روک رہے تھے۔

آپ ان ڈاکٹروں کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو بالکل بنیادی طبی خدمات سرانجام دینا چاہتے تھے۔ ان کے پاس دل کے اور ذیابیطس کے مریض تھے یا اسی طرح کے مسائل تھے۔ وہ ان کے لیے کچھ بھی کر نہیں سکتے تھے کیوں کہ ان کا علاج کرنے کے سامان کو اسرائیلی فوج جان بوجھ کر روک رہی تھی۔ یہ سامان مصر میں ٹرکوں پر موجود تھا، اردن میں ایسا سامان تھا۔ لیکن غزہ کو اس سامان سے روک دیا گیا تھا۔

ایسے حالات جان بوجھ کر پیدا کر دیے گئے تھے۔ اور ایسا مسلسل ہو رہا تھا۔ مجھے کہنا چاہیے کہ پبلک سروس ہر معاشرے میں بلا روک ٹوک جاری رہنی چاہیے۔ اس سروس میں پینے کا پانی، نکاسیٔ آب، بجلی، حتیٰ کہ پناہ گاہ۔ ان میں سے کوئی بھی شے ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ''کافی'' تھی یا ہے، درست لفظ ''نہیں'' ہے۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ غزہ میں ان میں سے ہر ایک ہولناک حد تک کم تھی اور ہے۔

ہم جن چیزوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک بریکنگ نیوز تھی۔ ہم ان بچوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں جن کو خطرناک حد تک کم کر دیا گیا تھا۔ ان میں غذا شامل ہے۔ ہم ان تمام بیماریوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو بہت آسانی سے ایک فرد یا بچے سے دوسرے فرد یا بچے کو لگ جانے والی ہے۔ غزہ کے پر ہجوم کاغذی شیلٹرز میں یہی معاملہ تھا اور ہے۔ ٹینٹ کالونیاں ان سے بھری پڑی ہیں۔ یہ حالات ایسے ہیں جو مستقل جاری رہنے والے ہیں۔ ان میں کوئی ریلیف نہیں ہے، لوگ ایسے ہی قابل رحم حالات میں رہنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں اور پھر فراڈ جنگ بندی کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کی اشاعت 1200 فلسطینی بلا جرم مارے گئے۔ (اب یہ تعداد 5000 سے تجاوز کر چکی ہے)۔ یہ فلسطینی 9 اکتوبر 2025ء سے اب تک مارے گئے ہیں۔

مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے، کیا ہو گا؟ ممکن ہے کہ آپ دیکھ سکتے ہوں، نیتن یاہو نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہر سیز فائر یا جنگ بندی کو مسترد کرتا ہے اور کرتا رہے گا تا آنکہ اسرائیل اگلے مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اس مرحلے کے بارے میں اعلان بورڈ آف پیس (پہلے کون سی بات پر عمل کیا گیا ہے) نے کیا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ حالات بدترین ہوتے جا رہے ہیں۔

جب ہم ان بہت سے لوگوں کے بارے میں بات کرتے ہیں، جن کے ساتھ ہم نے غزہ میں کام کیا ہے، وہ فلم میں نظر آئیں گے۔ یہ دراصل فلم کا پس منظر ہے۔ یا پھر وہ سینماٹو گرافرز ہیں جن کے بارے میں پوہ نے اشارہ کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کے پاس ایسی اشیاء تھیں جن سے زندگی کو دوام دیا جا سکتا۔ انہیں ان کے گھروں میں ہی تحفظ مل سکتا یا وہ خیموں میں محفوظ رہ سکتے۔ معاملات مسلسل خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ یہ باتیں خبروں کے گرداب میں پھنس کے رہ گئی تھیں۔

جے وی: طاہر، تمہاری فلم میں تمہارے، تمہارے ساتھیوں کے بارے میں مناظر ہیں جن میں وہ طبی سپلائی جمع کر رہے ہے، ان میں Scrubs اور ربر بینڈ شامل تھے۔ مارک اینٹی بائیوٹک ادویات کو چھپا رہا تھا۔ اس فلم نے حقیقی طور پر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس نے حقیقت کھول کر دنیا کے سامنے بیان کر دی ہے۔ اس فلم نے ہسپتالوں پر حملوں اور ان کے بعد کے مناظر پیش کیے ہیں۔ یہ سوچنا بھی بہت مشکل ہے کہ ہسپتالوں کو حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور کیا کچھ نہیں ہوا؟ مغربی میڈیا نے اسے فساد کی جڑ قرار دے ڈالا۔ اس فلم کو فلماتے ہوئے لوگوں کے اندر کا تعصب سامنے لایا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ پوہ اور تم نے یہ کام بہت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

فلم کے آغاز میں وہ کلپ ہے جس میں CNN ڈاکٹر پرل کے تبصر کو ''پرلے درجے کے الزامات'' قرار دیا۔ اور کہا کہ سی این این آزادانہ طور پر ان کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ ان میں اسرائیل عام شہریوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ سی این این ہی دکھا رہا ہے کہ ڈاکٹر بش طاہر پر ایک سوال داغتی ہیں جو غزہ میں امداد جانے کے بارے میں ہے۔ وہ کہتی ہیں: ''کیا حماس دکھانا پسند کرے گی کہ اس نے غزہ کے اندر خوراک کس طرح سے لے جانے دی؟ فلم میں ایک مقام پر سی این این کا اینکر خود کہتا ہے کہ غزہ کے لوگوں تک خوراک آزادانہ لے جانے نہیں دی گئی۔ کیا آپ اس تعصب پر بات بھی کر سکتے ہیں ہیں اور وہ بھی سی این این پر لائیو آن ائیر کر سکتے ہیں؟ وہ یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ درست طور پر حالات کی عکاسی نہیں کی گئی۔ کیوں؟ ہر موقع پر بیانیہ اسرائیلی حکومت کے حق میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب فلم میں دکھانا کیوں ضروری تھا؟

پی ٹی: آپ کے اس سوال پر میں بہت خوش ہوں۔ میں کہوں گا کہ میرے ڈاکومینٹری ڈائریکٹر بننے سے پہلے میں صحافی تھا۔ میں نے بہت سی مستحکم میڈیا آرگنائزیشنز کے لیے کام کیا ہے۔ میں نے بہت سے مواقع پر بہت کچھ سیکھا ہے لیکن جب غزہ والوں نے سکھایا، وہ غزہ کے صحافیوں نے ہی سکھایا۔ میری اس سچائی سے آپ ضرور پریشان ہوئے ہوں گے۔ کیا ہو؟ یہ اس وقت کیوں کیا گیا جب صحافی اغواء کر لیے گئے۔ انہیں روس لے جایا گیا۔ یا انہیں یوکرائن میں قتل کر دیا گیا، انہیں دنیا کے دیگر حصوں میں لے جا کر مار دیا گیا۔ اچانک ہمارے سرپرست اچانک ہی ایک ہو گئے۔ غزہ کے صحافیوں کو مغربی کنارے یا لبنان لے جا کر مار دیا گیا۔ انہیں یوکرائن لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ لوگ اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ آخر ہو کیا رہا تھا؟ ساری فلم ہی مختلف مناظر سے بھری ہوئی ہے۔ آپ اس فلم کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر مارک، ڈاکٹر طاہر اور ڈاکٹر فیروز کی دنیا میں گھوم رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم ان مناظر کی فلم بندی کر رہے تھے، ہم سے میڈیا مختلف نوعیت کے سوالات کر رہا تھا۔ میں واقعی وہ سب دکھانا چاہتا تھا جس کے وہ دکھائے جانے کے خلاف تھے۔ الجزیرہ کے سابق ڈاکومینٹری کمشنر کے طور پر اسے دیکھتے ہوئے میرے ساتھیوں پر حملے کیے گئے۔ ان مناظر کو فلمانا بہت، بہت ہی مشکل کام تھا۔ اب جب کہ ہم فلم بنانے لگے ہیں۔ ہم ڈاکٹروں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح جانیں بچا رہے ہیں۔ وہ درندگی کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور پھر وہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن میڈیا ہمیں کرش کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔

میں سب دیکھ بھی رہا تھا اور فلم بھی بنا رہا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا کہ وہ سب کچھ فلم میں ہو جو وہاں ہو رہا تھا۔ وہاں افراد تھے جو باقاعدہ ریگولر تھے۔ طاہر، فیروز اور مارک۔۔ وہ ہر آدمی کے لیے بہت کچھ کرنے کو تیار تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ہمیں لوگوں کا تعاون حاصل نہیں تھا، بالکل یہ تعاون حاصل تھا۔

لیکن لوگوں کو بار بار سمجھانا پڑتا تھا تا کہ ہم درست طور پر کام کرتے رہیں۔ مجھے ذرہ بھر بھی راستہ نظر آتا تو میں ڈاکٹروں کو وہاں لے جاتا تھا۔ جے وی: طاہر، ایک منظر وہ بھی تھا جس میں تم اعتراف کرتے ہو، ہر وقت میں نروس ہو جاتا جب مارک انٹرویوز کر رہا ہوتا۔ کیوں کہ تم واقعی اس طرح کی چیزوں پر بات کرتے تھے جیسے صہیونیت ہے۔ تم لوگوں کے رویوں کو دیکھ کر دل برداشتہ ہو جاتے۔ ہمیں سب کو مجرم ہونے کا احساس ہوتا۔

طاہر احمد: جی ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایسی چیز تھی کہ ہم سب سمجھ دار تھے۔ ہم فلسطینی کمیونٹی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بات قابل فہم تھی کہ اس کمیونٹی کے ساتھ انسانوں سا سلوک نہیں کیا گیا۔ انہیں صرف میڈیا میں کم تر انسان کے طور پر نہیں دکھایا گیا تھا بلکہ آرٹ اور لٹریچر میں بھی ان کی کردار کشی جاری تھی۔

مجھے یاد ہے جب میں میڈیکل سکول میں تھا۔ ہمیں کہا جاتا تھا پڑھو، پڑھو اور زیادہ پڑھو۔ اسے ہماری شخصیت سازی کا حصہ بنایا جاتا۔ کتاب کے وسط میں ایک تبصرہ ہوتا تھا۔ یہ بہت مختصر تبصرہ ہوتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ فلسطینی دہشت گرد ہوتا ہے۔ وہ کچھ بہت خطرناک اور پرتشدد ہوتا ہے۔ اس طرح ملک بھر کے میڈیکل کے طلبہ کو یہ سبق باقاعدگی سے پڑھایا جاتا تھا۔ اس سے یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ فلسطینی کے بارے میں کیا سوچ پیدا کی جاتی تھی۔ جی ہاں! بالکل ہم اسے مسترد کرتے تھے۔ لیکن فلسطینیوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کو کس طرح پیش کیا جاتا تھا اور ان کے بارے میں منفی سوچ پیدا کی جاتی تھی۔

مجھے جس بات کی فکر تھی، خاص طور پر یہ کہ وہ کیسا نظر آتا تھا۔ وہ کس طرح کی باتیں کرتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میڈیا اور بہت سے دوسرے لوگ فلسطین کے معاملے کو پیچیدہ بناتے تھے۔ وہ کہنا چاہتے تھے: ''یہ ایک لکھا ہوا معاملہ ہے۔ وہاں دو قسم کے لوگ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس بارے میں گفتگو کرتے رہتے تھے۔'' ہم جانتے تھے کہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ ہولناک ہے۔ یہ سب کھل کر ہمارے سامنے آرہا تھا۔ اور جو کچھ ہمارے سامنے آتا تھا وہ بہت خوفناک ہوتا تھا۔ اسی طرح کی خوفناک چیزیں رونما ہوتی تھیں۔ یا کہ گروپ کے لوگوں کے ساتھ اس ادارے میں یہی کچھ ہوا کرتا تھا۔

پی ٹی: میں اس میں اضافہ کروں گا۔ میں جس چیز کو بہت احترام سے دیکھتا ہوں وہ طاہر کے بارے میں ہے۔ وہ ایک لیڈر ہے اور آپ سے بالکل ایمانداری سے یہ بات کہتا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کے کہے الفاظ بہت دور تک جاتے ہیں۔ وہ صورت حال کے مطابق بالکل درست بات کرتا ہے۔

ہماری ٹیم میں ایک عورت، رنگ کے اعتبار سے مختلف اور بہ مشکل پانچ فٹ قد۔ سچی بات ہے کہ جب میں ایک صحافی کے طور پر کمرے میں داخل ہوا، ایک فلم میکر کی حیثیت سے میرا اپنا تاثر یہی ہے۔ لیکن میں سوچ اور دیکھ سکتا ہوں کہ ایک فلسطینی کیسا ہوتا ہے۔ میں انہیں کبھی بھی سمجھ نہیں سکا۔ میں اس بارے میں سیکھ رہا تھا اور خصوصاً ڈاکٹر طاہر سے بہت مدد ملی۔ میں ان کے بارے میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ ڈاکٹر طاہر کو میں نے کئی حوالوں سے، بہت سے زاویوں سے دیکھا۔ وہ ایک لیڈر تھا، آپ کے ساتھ مخلص جس کے کہے الفاظ بہت معانی رکھتے تھے۔ وہ حالات کو سمجھ کے پوری بات کرنے کا عادی تھا۔

جے وی: طاہر، تم کوئی بات کرنا چاہو گے؟

ڈاکٹر طاہر: میں نے فلسطینیوں کے بارے میں جو نوٹ کیا ہے۔ ایسی ایک بات جو انہیں جاننے میں مدد دیتی ہے اور ہمیں بھی کام جاری رکھنے میں آمادہ رکھتی ہے، کم از کم مجھے حوصلہ دیتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو آگے بڑھنے کے لیے تیار کرتے ہیں، انہیں مختلف پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں اور جہاں ضرورت ہو، اپنی ذاتی رقوم دوسروں کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔

چناں چہ جب بھی مجھے تشویش ہوئی کہ ہمارا یہ کام، دنیا کو غزہ کے حالات دکھانے کے لیے فلم بندی میں فراہم کرتے رہے ہیں اور ہمیں دن کا سورج دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر قسم کے حالات ہمارے خلاف تھے۔ کسی انسان کو مارنا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پوہ اور ریم اپنا کام مسلسل کر رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ انہیں صرف اپنے کام سے مطلب تھا۔ ہمارے ساتھ جراجیکٹ پر کام کرنے والے دیگر لوگ آگے بڑھ کے کام کرتے، پوہ اور ریم ہم سے کہتے: ''فکر نہ کرو، ہم بہت شروع سے کام کر رہے ہیں، آپ ہمیں آگے بھی تیار اور مستعد پائیں گے۔ ہم آپ کو ہرگز مایوس نہیں ہونے دیں گے۔''

میں سوچتا ہوں کہ امریکہ میں ہماری کمیونٹی سوچتی تھی، جن کا ہم سے رابطہ تھا کہ ہمیں خاموش کرادیا یا کردیا جائے گا۔ جب کہ ہر کوئی اپنے حصے کے کام کے بارے میں بات کرتا تھا کہ آپ فلسطینیوں کو آگے کرنے کے بارے میں سوچیں یا ان کو دعوت دیں کہ وہ ہماری مدد کو آئیں، ہم اپنا کام کر رہے تھے۔ خاموش کرائے جانے کی فکر ہمیں ہر لمحہ رہتی تھی۔

یہ خدشہ بھی تھا کہ ان کو شامل کرنے سے تعصب سے ہمارے کام کو دیکھا جائے گا، یہ سب بہت عجیب تھا۔

ہم آپس میں بات کرتے تھے کہ ہمارے بیانیہ کا کیا ہوگا؟ ہمیں خود اپنے ہی بیانیے پر کام سے روک دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا بیانیہ کوئی آسان نہیں تھا۔ ہم جو ڈھانچہ تیار کرتے تھے، اسے مکمل بنانے میں شدید مشکلات تھیں۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے کام میں سرمایہ لگانے کو تیار ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانے پر آمادہ رہتے تھے۔ وہ پوہ، مارک اور فیروز کو نجات دہندہ خیال کرتے کہ وہ ان کا حال دنیا کو دکھانے والے ہیں۔ مجھے خود یہ لگتا تھا کہ ہمیں وہ توانائی مل رہی ہے جس کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ جب بھی آپ دیکھتے کہ سارا کچھ رک گیا ہے یا روک دیا گیا ہے، ہمارے کام سے نسل کشی کا اصل چہرہ سامنے آرہا تھا۔ یہ یقیناً بہت بھاری کام تھا۔

جے وی: میں متجسس ہوں، پوہ کہ تم نے شروع میں ہی اس فلم بندی کا راستہ کس طرح سے طے کرلیا تھا۔ یہ سارا عمل کس طرح چیزوں کو کھول رہا تھا۔

پی ٹی: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ سارا کام کس طرح شروع ہوا۔ مجھے مارک سے ملنے کا اچانک موقع ملا۔ میں نے انہیں مختلف نوعیت کے انٹرویوز کرتے دیکھا۔ ایک رپورٹر نے ان سے دریافت کیا، یہ 2025ء کا آخر چل رہا تھا۔ یہ آخری سال تھا اور ایک رپورٹر نے ان سے پوچھا تھا: ڈاکٹر مارک تم ابھی غزہ سے واپس لوٹے ہو۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ کسی جنگ بندی کا امکان نہیں ہے۔

مارک کو الفاظ چبانے کی عادت نہیں تھی، چناں چہ انہوں نے صاف طور پر کہا، کوئی بھی سیز فائر اس لیے نہیں ہوسکتی کیوں کہ نسل کشی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے گروہوں کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

چند ہفتے بعد وہ نیویارک میں بات کر رہے تھے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو مجھے ڈاکٹر طاہر سے متعارف کروانے کے بعد اور فیروز سے ملاتے ہوئے میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مارک، طاہر اور فیروز معاملے کو کس طرح سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن آپ تازہ سیاسی لینڈ سکیپ کے بارے میں کیا کہیں گے؟ اس میں ہم دیکھ رہے تھے کہ امریکہ کی اسرائیل کے لیے سپورٹ بہت حد تک کم ہوتی نظر آرہی تھی۔ جو سیاسی لوگ چاہتے تھے اور اس کے لیے مہم بھی چلا رہے تھے۔ اب فلسطینی کے حامی سیاست دان امریکہ کی پرائمری سیاست میں آگے آگئے تھے۔

ٹی اے: یہ بہت شاندار تبدیلی ہے کہ یہ تبدیلی کس طرح سے رونما ہو رہی ہے۔ اس میں اڑھائی سال لگے تھے۔ آپ پہلے بات کرتے تھے اور غالباً نومبر 2023ء کی یہ بات ہے کہ سین زوم پر آٹھ سینیٹرز سے بات کرنے کا موقع ملا۔ یہ سب ڈیموکریٹس تھے اور سب جنگ بندی چاہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب شفا ہسپتال کو اسرائیلی فوج گھیرے میں لے چکی تھی۔ اس وقت نوزائیدہ بچوں کی انتہائی نگہداشت کی وارڈ میں 38 بچے بچیاں

تھیں۔ان میں سے سات انکوبیٹر میں تھے۔باقی نرسری میں تھے۔ یہ مجھے یاد ہے کہ میں بہت پریشان تھا۔ میں کہہ رہا تھا: ''ہمیں واقعی جنگ بندی کی ضرورت ہے۔''اس وقت آرمڈ سروسز کمیٹی کے رکن ایک سینیٹر نے میری بات کاٹ دی اور کہا: ''سیز فائر ایک فوجی اصطلاح ہے۔ہم کسی سیز فائر کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہماری ساری توجہ اس طرف ہے کہ انسانی بنیادوں پر امداد رکنے نہ پائے۔ میں وہاں سے لوٹا تو جو خاکے میرے ذہن میں بن رہے تھے کہ جب بھوک اپنے پورے زوروں پر ہوجائے گی تب کانگریس کے کئی ارکان کہاں ہوں گے؟ اب تک عوام میں بات کرنے والے ارکان سینیٹ کہاں ہوں گے؟ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے غصے کی حالت میں تھے اور کہہ رہے تھے: ''ہمیں حقیقت میں سیز فائر کی ضرورت ہے۔''

پھر ہم نے دیکھا کہ ترقی پسند سیاست دان کہہ رہے تھے کہ غزہ اور مجموعی طور پر فلسطین میں ہماری پالیسی مکمل طور پر ناکام ہے۔ یہ پالیسی نسل پرستی کو سپورٹ کر رہی ہے۔لوگوں کو مروا رہی ہے۔ اس میں زبردست حیرانی کی بات یہ ہے کہ کس طرح سے اس مقصد کے لیے فنڈز جمع کیے جا رہے تھے، یہ لوگ مقتدرہ میں کس طرح سے اپنی ہمدردیاں تبدیل کر رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ کہوں گا کہ دو ایک چیزیں ایسی تھیں جن پر مجھے تشویش تھی۔ ایک تو ہماری فلم کی ٹائمنگ تھی۔ مجھے یہ بہت مناسب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اسرائیل کی حمایت امریکہ میں زوروں پر تھی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ بہت سے لوگ ماڈریٹ تھے۔لیکن ماڈریٹس تو ڈیموکریٹ تھے۔ کچھ تھے جو ری پبلکن تھے۔ ان کو آپ دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنے مؤقف میں بہت سخت تھے۔ وہ حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتے تھے۔ گویا وہ نسل پرستی کے حامی تھے۔ وہ مختلف راستوں اور طریقوں سے اس کی حمایت کر رہے تھے۔

امریکیوں کی بڑی تعداد اس صورت حال کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے، اس کا اعتراف کرنے والے بہت کم ہوتے جا رہے تھے۔ اور یہ کہ مشرق وسطیٰ سے فوجی امداد اور جنگیں اور ان کا امریکی کمیونٹیز کو ملنے والا فائدہ، ہیلتھ کیئر کے لیے امریکہ میں کام آ رہا تھا۔ امریکہ میں محروم طبقات کو اس سے مددی جا رہی تھی۔ گویا نسل کشی سے امریکہ کے داخلی مسائل کے لیے سرمایہ مل رہا تھا۔ اسرائیلی معاشرے کو اپنے لوگوں کے لیے دولت فراہم ہو رہی تھی۔ وہاں تعلیم مفت دی جا رہی تھی، صحت کی سہولتیں دی جا رہی تھیں۔ یہ سب کچھ ہمارے پاس نہ تھا۔ ہمیں کہیں سے امداد نہیں مل رہی تھی۔ جو دولت رکھتے تھے، انہیں مزید سرمایہ مل رہا تھا۔ جو دولت سے محروم تھے، ان سے رہی سہی دولت بھی چھینی جا رہی تھی۔ آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ اس صورت حال میں بھی فطری عوامی تحریک کی مخالفت ہو رہی تھی۔ اس لیے بھی مجھے لگتا تھا کہ غزہ کے حالات پر ہماری یہ فلم لوگوں کو آمادہ کر سکے گی کہ غزہ کے لیے متحرک ہوا جائے اور لوگوں میں غزہ کی وکالت کی جائے۔

چناں چہ ہم اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہم تمام تر مخالف حالات کے باوجود اس فلم کو مسلسل متعارف کرا رہے تھے۔ اگرچہ بات اب تبدیل ہو رہی تھی، صرف یہ امکان باقی رہ گیا تھا کہ لوگ ہماری بات بھی سنیں گے۔

عبدل نے پرائمری جیت لی تھی، یہ بڑی بات تھی۔ وہ اب مشی گن میں ایک بڑی جدوجہد کرنے کی تیاری میں تھے۔ ان کے خلاف خاصی بڑی رقم جمع ہو رہی تھی۔ ظہران ممدانی نے میئر کا الیکشن جیت لیا تھا۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ان کی ہر بات اور ہر کام کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ یہ صرف ایک شہر کے الیکشن کا معاملہ تھا۔ اس سے ان کی اہلیہ کا کوئی تعلق نہ تھا کہ وہ کیا کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک مائیکروسکوپ میں دیکھا جا رہا تھا۔ یہ ایک بڑی جنگ ہونے جا رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صہیونیت اس معاشرے میں بہت زیادہ سرایت کر چکی تھی۔ اسرائیل کے فلسطین پر قبضے کی حمایت عام سی بات تھی۔ اسرائیلی فوج کی بہت زیادہ حمایت موجود تھی۔ اس کے باوجود یہ امکان موجود تھا کہ وہیں سے فلسطین پر قبضے کو موضوع بنایا جائے۔ میرے خیال میں یہ ایک متشدد کھیل کا میدان تھا جس میں ممدانی کھیل رہے تھے۔ یہ ملک اسی طرح سے ہی معاملات کا مقابلہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری فلم کی قوت ایسی تھی جو میرے خیال میں حکمت عملی کو حقیقت میں تبدیل کرنے والی تھی۔ لوگ اسے دیکھ رہے تھے اور متحرک ہو رہے تھے۔

جے وی: یہی بات ڈاکٹر فیروز کرتے رہے تھے۔ وہ فلم کے آخر میں بھی یہی بات کر رہے تھے۔ وہ اس کانفرنس میں بھی موجود تھی جس میں jewish voice for peace کی صدا بہت بلند تھی۔ وہ شک کا اظہار کر رہے تھے کہ ملکی سطح پر میڈیا میں ہمیں کسی قسم کی پذیرائی ملے گی۔ پھر اس کانفرنس کے شرکاء کی اکثریت نے کہا کہ اس فلم سے فرق پڑے گا۔ پھر انہوں نے مایوسی برقرار رکھی لیکن ساتھ ہی حالات ایسے بن رہے تھے کہ انہیں لگتا تھا کہ ہمیں کام جاری رکھنا چاہیے۔ مجھے حیرانی تھی کہ ہم کہاں کھڑے تھے۔ اس سے بڑے پیمانے پر بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ میڈیا میں اس کا محدود خیر مقدم جسے ہم چاہتے تھے کہ بڑھے، ہمیں اس کے لیے باقاعدہ کشتی لڑنا پڑ رہی تھی۔

پی ٹی: میں یہ کہوں گا، اپنے مقصد کے لیے نکلنے کے بعد میں یہ وہ سب سوچنا بند کر دیا تھا جو میں بہت عرصے سے سوچ رہا تھا۔ یہ فلم بنانے میں، خصوصاً جب ہم نے اسے فلمانا شروع کیا تھا، آغاز میں ہمیں خاصی مایوسی نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اچھی رائے اب سامنے آ رہی تھی۔ میں صرف اس پر نظریں جمائے ہوا تھا کہ ہمیں کرنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ہم سٹرکچرز اور سسٹم سٹرکچرز سے لڑ نہیں سکتے تھے۔ بہت سی اور بھی چیزیں تھیں۔ مجھے افسوس نہیں ہے کہ ہماری سوچ کیا تھی یا ہم ماضی میں اپنے اقدامات پر شرمندہ نہیں تھے۔ ہم مستقبل کے بارے میں رائے نہیں بنا سکتے تھے۔ ہمارے پاس کچھ کرنے کی قوت تھی اور یہی سب سے کامیاب رہی۔

اب مجھے یقین ہے کہ جس نوعیت کی فلم ہم بنانا چاہ رہے تھے، ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ اس میں دیکھنے والوں کے لیے وہ سب کچھ تھا جو وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے امید ہے کہ جوں جوں لوگ اسے دیکھیں گے وہ بھی محسوس کریں گے کہ فلم انہیں کیا پیغام دے رہی ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ ہم حالات پر توجہ دیتے۔ کیوں کہ آپ نہیں جانتے جب آپ پوری توجہ دیں گے تو بہت سے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔

جے وی: ہمیں اب معاملات کو سمیٹنا ہے۔ آپ دونوں کا شکریہ کہ آپ سے مل کر ہم ایک ٹیم بن سکے۔ انٹرسپٹ کی بریفنگ کا بھی شکریہ۔

طاہر احمد: آپ سب کا شکریہ

پی ٹی: جوناتھا تمہارا بھی شکریہ

جے وی: ہم آپ کو سننا چاہیں گے۔

ہمیں ضرور بتائیں کہ ہم کس قدر کامیاب رہے۔

عقوبت خانے سے: ابوشمائل

قید، تشدد اور خاموشی

اسرائیلی حراست سے رہا ہونے والے فلسطینی صحافیوں کی لرزہ خیز داستانیں

انتباہ: اس مضمون میں جسمانی، نفسیاتی اور جنسی تشدد کی تفصیلی اور گرافک تفصیلات شامل ہیں۔

فلسطینی صحافی احمد عبدالعل آج بھی اس لمحے کو نہیں بھول سکے جب اچانک کان پھاڑ دینے والی موسیقی شروع ہوئی۔ احمد کے مطابق، اسرائیلی حراستی مرکز میں انہیں مسلسل پانچ دن تک آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک کمرے میں رکھا گیا۔ ان کے کپڑے اتار دیے گئے، انہیں مارا پیٹا گیا اور اسی دوران انتہائی بلند آواز میں عبرانی اور انگریزی گانے مسلسل بجائے جاتے رہے۔ جب بھی وہ بے ہوشی کی حالت میں جانے لگتے، بجلی کا جھٹکا یا جسم پر پڑنے والی کوئی ضرب انہیں دوبارہ ہوش میں لے آتی۔

ایک اور فلسطینی صحافی، جس نے انتقامی کارروائی کے خوف سے اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی، نے بھی اسی نوعیت کے ایک کمرے کا ذکر کیا جسے زیرِ حراست افراد ''ڈسکوروم'' کہتے ہیں۔

اس صحافی کے مطابق، فوجیوں نے اس کے اعضائے تناسل کو پلاسٹک کی زِپ ٹائیز سے باندھ دیا اور اسے اس قدر تشدد کا نشانہ بنایا کہ زخموں کے باعث اس کے لیے خون کے بغیر پیشاب کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ اس نے بتایا:

''انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب میں مرد نہیں رہوں گا۔''

یہ صرف دو افراد کی کہانی نہیں۔

یہ ان 59 فلسطینی صحافیوں کی تفصیلی شہادتوں میں سے دو ہیں جن کے انٹرویوز کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس (CPJ) نے کیے۔ یہ تمام صحافی 7 اکتوبر 2023 کے بعد اسرائیلی حراست سے رہا ہوئے تھے۔ ان 59 صحافیوں میں سے 58 یعنی ایک کے سوا تمام نے بتایا کہ انہیں تشدد، بدسلوکی یا کسی نہ کسی شکل میں جسمانی یا نفسیاتی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ عرصہ تھا جس کے بارے میں انسانی حقوق کی متعدد تنظیموں نے غزہ میں جاری کارروائیوں کو نسل کشی قرار دیا ہے۔

صحافیوں کی حراست کا وسیع دائرہ:

CPJ نے 7 اکتوبر 2023 کے بعد کم از کم 94 فلسطینی صحافیوں اور ایک میڈیا ورکر کی اسرائیلی حراست کو دستاویزی شکل دی ہے۔ ان میں غزہ سے تعلق رکھنے والے 32 صحافی اور ایک میڈیا ورکر، مغربی کنارے سے تعلق رکھنے والے 60 صحافی اور اسرائیل کے اندر سے گرفتار کیے گئے 2 صحافی شامل ہیں۔ 19 فروری 2026 تک ان میں سے 30 صحافی بدستور حراست میں تھے۔

CPJ کی Prison Census2025 کے مطابق، 2023 سے اسرائیل صحافیوں کو قید کرنے والے ممالک میں نمایاں طور پر شامل رہا ہے۔

CPJ نے 7 اکتوبر 2023 کے بعد اسرائیلی حراست سے رہا ہونے والے تمام 65 صحافیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک، اسماعیل الغول، اسرائیلی فضائی حملے میں مارا گیا، جبکہ دیگر پانچ نے CPJ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔

شہادتیں کیا بتاتی ہیں؟

CPJ ہر الزام کی آزادانہ طور پر تصدیق نہیں کر سکا، تاہم صحافیوں کی شہادتیں انسانی حقوق کی ان تحقیقات سے مطابقت رکھتی ہیں جن میں اسرائیلی حراستی مراکز میں فلسطینیوں کے ساتھ اسی نوعیت کے سلوک کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اسرائیلی انسانی حقوق کی تنظیم بتسلیم (B'Tselem) نے ایسے حراستی مراکز کے مجموعے کو ''تشدد کے کیمپوں کا ایک نیٹ ورک'' قرار دیا ہے۔

حراستی مراکز مختلف تھے، حالات بھی ایک جیسے نہیں تھے، لیکن صحافیوں کی شہادتوں میں تشدد کے طریقوں کی حیرت انگیز مماثلت نظر آتی ہے۔

مار پیٹ، تکلیف دہ جسمانی پوزیشنز، حسی محرومی، جنسی تشدد اور طبی غفلت یہ سب متعدد شہادتوں میں بار بار سامنے آئے۔

10 صحافیوں نے اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی درخواست کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسرائیلی تفتیش کاروں اور جیل سروس کے اہلکاروں نے انہیں عوامی سطح پر بات کرنے کی صورت میں دوبارہ گرفتار کرنے یا قتل کرنے کی دھمکیاں دیں۔ ایسی دھمکیوں کا ذکر 31 انفرادی شہادتوں میں موجود ہے۔ ان دھمکیوں کے اثرات صرف جیل کی چار دیواری تک محدود نہیں رہے۔ کئی صحافیوں نے حراست کے بعد صحافت سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

CPJ کی علاقائی ڈائریکٹر سارا قدح کہتی ہیں:

''یہ الگ تھلگ واقعات نہیں ہیں۔ درجنوں واقعات میں CPJ نے بدسلوکی کے ایک مسلسل دہرائے جانے والے سلسلے کو دستاویزی شکل دی ہے۔ 'مار پیٹ سے لے کر بھوک، جنسی تشدد اور طبی غفلت تک' جس کا نشانہ صحافیوں کو ان کے کام کی وجہ سے بنایا گیا۔ یہ واقعات صحافیوں کو خوف زدہ اور خاموش کرنے اور ان کی گواہی دینے کی صلاحیت کو ختم کرنے کی ایک دانستہ حکمت عملی کو ظاہر کرتے ہیں۔ عالمی برادری کی مسلسل خاموشی صرف اس صورتحال کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔''

بیشتر صحافیوں پر کوئی الزام بھی نہیں تھا۔

رپورٹ میں ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے۔

59 میں سے 48 صحافیوں پر کسی جرم کا الزام ہی عائد نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انہیں اسرائیل کے انتظامی حراست کے نظام کے تحت قید رکھا گیا۔ اس نظام کے تحت کسی شخص کو باضابطہ الزام یا مقدمے کے بغیر عام طور پر چھ ماہ تک حراست میں رکھا جا سکتا ہے، اور اس مدت میں بار بار توسیع کی جا سکتی ہے۔ باقی 10 صحافیوں پر اشتعال انگیزی، ریاست مخالف سرگرمی یا دہشت گردی کی حمایت جیسے الزامات عائد کیے گئے تھے۔

بین الاقوامی قانون اور تشدد کی تعریف

اقوام متحدہ کے کنونشن برائے انسدادِ تشدد، جس کی اسرائیل نے توثیق کر رکھی ہے، کے مطابق تشدد سے مراد کسی شخص پر جان بوجھ کر شدید جسمانی یا ذہنی تکلیف مسلط کرنا ہے، بالخصوص معلومات یا اعتراف حاصل کرنے، سزا دینے، خوف زدہ کرنے، دباؤ ڈالنے یا امتیازی سلوک کے مقصد سے، جب یہ کسی سرکاری اہلکار یا سرکاری حیثیت میں کام کرنے والے فرد کی جانب سے یا اس کی رضامندی، ہدایت یا چشم پوشی سے کیا جائے۔

نومبر 2025 میں اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے انسدادِ تشدد کے ماہر اور ملکی امور کے نمائندے پیٹر ویدل کیسنگ نے کہا کہ اسرائیل کی جانب سے کنونشن کی توثیق اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ ریاست تشدد اور غیر انسانی سلوک کے خاتمے اور روک تھام کے لیے آمادگی رکھتی ہے۔

تاہم ان کے مطابق کمیٹی کو مختلف ذرائع سے موصول ہونے والی بڑی تعداد میں رپورٹس پر ''شدید تشویش'' ہوئی، جن میں فلسطینیوں 'بشمول بچوں اور دیگر کمزور طبقات' کے خلاف بظاہر منظم اور وسیع پیمانے پر تشدد اور غیر انسانی سلوک کی نشاندہی کی گئی تھی۔

صحافیوں کی شہادتیں ایک ایسے نظام کی تصویر پیش کرتی ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد انہیں خاموش کرنا اور غزہ و مغربی کنارے سے نکلنے والی خبریں دنیا تک پہنچنے سے روکنا ہے۔

''کھیل ختم''

جس روز اسرائیلی فوج نے غزہ کے فوٹو جرنلسٹ شادی ابوسیدو کو حراست میں لیا، ایک فوجی اس کے قریب آیا اور انگریزی میں صرف دو الفاظ کہے:

''Game over''، ''کھیل ختم۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے زیرِ حراست افراد ''التشریفہ'' یا ''عظیم استقبال'' کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح ان کے مطابق اسرائیلی جیلوں میں پہنچنے والے نئے قیدیوں کو اجتماعی اور منظم انداز میں مارنے پیٹنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

شادی ابوسیدو کے مطابق، سدی تیمان حراستی کیمپ منتقل کیے جانے کے بعد اسے ہتھکڑیاں لگائی گئیں، آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور فوجیوں کی ایک قطار کے درمیان سے گزارا گیا۔ راستے میں فوجی اسے ڈنڈوں سے مارتے اور لاتیں مارتے رہے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اس کی ایک پسلی ٹوٹ چکی تھی۔ یہ تجربہ صرف ابوسیدو تک محدود نہیں تھا۔

59 صحافیوں میں سے 56 نے بتایا کہ انہیں جیلوں کے اندر حکام نے بار بار مارا پیٹا۔ بہت سے افراد نے گرفتاری اور حراستی مراکز میں منتقلی کے دوران بھی تشدد کی شکایت کی۔

ٹوٹی ہوئی پسلیاں، زخمی ریڑھ کی ہڈی اور زبان کا کٹ جانا

مغربی کنارے کے صحافی مصطفیٰ خواجہ نے بتایا کہ 14 مارچ 2024 کو شطہ جیل میں ہونے والی مار پیٹ کے نتیجے میں اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، گھٹنے کے مینسکس کو نقصان پہنچا اور ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹیں آئیں جن کی بعد میں تشخیص ہرنی ایٹڈ ڈسکس کے طور پر ہوئی۔

کتز یوت جیل میں زیرِ حراست صحافی محمد بدر نے بتایا کہ اسے اتنی شدت سے مارا گیا کہ اس کی زبان کٹ گئی۔ دو ہفتوں تک وہ بمشکل بول اور کھانا کھا سکا۔

اوفر جیل میں ریڈیو صحافی محمد الاطرش نے نومبر 2023 میں ایک منظم حملے کی تفصیل بیان کی جسے اس نے اور دیگر قیدیوں نے ''شن بیت پارٹی'' یا ''بن گویر پارٹی'' کا نام دیا۔ اس کے مطابق درجنوں قیدیوں کو اجتماعی سزا دی گئی۔

تربیت یافتہ کتوں کو قیدیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا، جبکہ دھاتی آلات کے ذریعے ایسے زخم لگائے گئے جن سے طویل عرصے تک خون بہتا رہا اور جسم پر مستقل نشانات پڑ گئے۔

غزہ سے تعلق رکھنے والے صحافیوں اسلام احمد اور اسامہ السید نے بھی مار پیٹ کے دوران وقفے وقفے سے بجلی کے جھٹکے اور مرچوں کا اسپرے استعمال کیے جانے کا ذکر کیا۔

کئی شہادتوں کے مطابق یہ کارروائی اسرائیل کے قومی سلامتی کے وزیر ایتامار بن گویر کے

دورے کے فوراً بعد ہوئی۔ بن گویر نے مختلف عوامی پلیٹ فارمز پر فلسطینی قیدیوں کے حالات مزید خراب ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ CPJ نے بن گویر اور اسرائیلی وزارتِ قومی سلامتی سے ان الزامات پر تبصرہ طلب کیا، لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

ایسے زخم جو بھر نہ سکے

صحافی محمد نافع قاعود نے بتایا کہ حراست کے ابتدائی مرحلے میں بار بار مار پیٹ کے باعث اس کے پاؤں پر گہرے زخم ہو گئے۔ اس کے مطابق علاج نہ ہونے کی وجہ سے زخموں میں انفیکشن ہو گیا اور ان میں ''کیڑے پڑ گئے''۔

جسمانی تشدد کے ساتھ ساتھ 36 صحافیوں یعنی تقریباً دو تہائی نے بتایا کہ انہیں طویل عرصے تک تکلیف دہ جسمانی پوزیشنز میں رکھا گیا۔

11 صحافیوں نے Strappado نامی طریقے کا ذکر کیا جسے فلسطینی صحافی ''گھوسٹ ہینگنگ'' یعنی ''بھوت کی طرح لٹکانا'' کہتے ہیں۔ اس طریقے میں کسی شخص کے ہاتھ پشت کے پیچھے باندھ کر اسے بازوؤں کے ذریعے معلق کیا جاتا اور پھر اوپر کی جانب کھینچا جاتا ہے۔ دیگر صحافیوں نے بتایا کہ انہیں گھنٹوں گھٹنوں کے بل بیٹھنے یا منہ کے بل لیٹنے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ نے بارش، براہِ راست دھوپ اور گندے پانی میں یا اس کے نیچے بندھے رہنے کی تفصیلات بیان کیں۔

صحافی سامی الساعی نے بتایا کہ فوجیوں نے اس کے حالیہ گردے کے آپریشن کی جگہ کو نشانہ بنایا، حالانکہ وہ انہیں اس آپریشن کے بارے میں بتا چکا تھا۔

صحافی عماد افرانجی نے CPJ کو بتایا:

''ہم جہنم سے واپس آئے ہیں۔''

یہی اصطلاح دیگر قیدی بھی سدی تیمان کے ایک حصے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

''ڈسکو روم''

اقوامِ متحدہ کی کمیٹی برائے انسدادِ تشدد (CAT) نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ طویل عرصے تک انتہائی بلند آواز میں موسیقی یا شور کا استعمال، اگر اس سے شدید جسمانی یا ذہنی تکلیف پیدا ہو، خصوصاً جب اسے دیگر جبری طریقوں کے ساتھ استعمال کیا جائے، کنونشن کے آرٹیکل 1 کے تحت تشدد کے زمرے میں آ سکتا ہے۔

CPJ کے مطابق کم از کم 14 صحافیوں نے بتایا کہ انہیں اسرائیلی حراستی مراکز میں، خصوصاً سدی تیمان میں، طویل عرصے تک انتہائی بلند آواز کے سامنے رکھا گیا۔ مسلسل بجنے والی موسیقی نے ان کے مطابق نیند چھین لی اور حسی انتشار پیدا کیا۔

کئی شہادتوں میں چوبیس گھنٹے کتوں کے بھونکنے کا بھی ذکر ہے، جس نے زیرِ حراست افراد کی ذہنی اذیت میں مزید اضافہ کیا۔ کم از کم سات صحافیوں، جن میں احمد عبدالعل بھی شامل ہیں، نے بتایا کہ انہیں کئی دن تک ایسے کمروں میں رکھا گیا جنہیں وہ ''ڈسکو روم'' کہتے تھے۔ اس کمرے میں اسپیکروں سے اتنی بلند آواز میں موسیقی بجائی جاتی تھی کہ نیند تقریباً ناممکن ہو جاتی تھی۔

فری لانس صحافی حاتم حمدان، جنہیں 5 فروری 2026 کو دوبارہ گرفتار کیا گیا، نے بتایا کہ اسے تقریباً نو گھنٹے تک ایک حراستی گاڑی میں رکھا گیا، جہاں مسلسل عبرانی زبان میں بلند آواز کی موسیقی بجائی جاتی رہی۔

صحافی لما خاطر نے بتایا کہ تفتیش کے دوران اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے 7 اکتوبر 2023 کو جنوبی اسرائیل پر حماس اور دیگر فلسطینی مسلح گروہوں کے حملوں سے متعلق دستاویزی فلمیں سننے پر مجبور کیا گیا، اس کے بعد اس سے سوالات کیے گئے۔

اسامہ السید، یوسف شرف اور عماد افرانجی نے بتایا کہ الشفا میڈیکل کمپلیکس سے گرفتاری کے بعد حراست کے دوران انتہائی بلند شدت کی صوتی بم جیسی آوازوں کا استعمال کیا گیا۔

طبی غفلت: زخموں پر مرہم کے بجائے مزید اذیت

CPJ کی تحقیقات میں طبی غفلت بدسلوکی کی سب سے زیادہ بار سامنے آنے والی شکلوں میں شامل تھی۔ اکثر یہ غفلت ان زخموں کو مزید سنگین بنا دیتی تھی جو مبینہ طور پر مار پیٹ یا تفتیش کے دوران لگے تھے۔ CPJ نے طبی غفلت کے 27 واقعات دستاویزی شکل میں جمع کیے۔ کئی معاملات میں طبی عملے پر تشدد میں شرکت یا اسے برداشت کرنے کے الزامات بھی سامنے آئے۔

صحافی یوسف شرف نے بتایا کہ بار بار کی مار پیٹ سے لگنے والے زخم جیلوں کے غیر صحت بخش حالات میں انفیکشن کا شکار ہو گئے اور اس کے جسم پر پھوڑے بن گئے۔ اس کے مطابق جیل حکام نے اسے طبی امداد فراہم نہیں کی۔

آخر کار ناصر میڈیکل کمپلیکس کے زیرِ حراست سرجن ڈاکٹر ناہد ابوطیمہ نے ساتھی قیدیوں کی مدد سے غیر رسمی طبی طریقوں کے ذریعے اس کے زخموں کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ ان طریقوں میں مبینہ طور پر ایسی چیز استعمال کی گئی جسے قیدی صفائی کا بلیچ سمجھتے تھے۔

صحافی ثائر فاخوری نے بتایا کہ عتصیون اور اوفر حراستی مراکز میں مار پیٹ کے دوران اس کی آنکھ کو شدید چوٹ لگی۔ اس کے مطابق تقریباً 20 دن تک اس کی بینائی عارضی طور پر متاثر رہی، لیکن اسے طبی علاج فراہم نہیں کیا گیا۔

صحافی محمد عماد سلطان نے بھی آنکھوں کی چوٹ اور طبی امداد سے محرومی کی شکایت کی تھی۔ رہائی کے بعد وہ مغربی غزہ میں اسرائیلی فضائی حملے میں مارا گیا۔ CPJ نے خارش،

نامعلوم نوعیت کے دانوں اور پھوڑوں، بے ہوشی کی دوا کے بغیر زخموں پر ٹانکے لگانے، بغیر علاج کے ہڈیوں کے فریکچر، آنکھوں کی چوٹوں، دمے کے دوروں اور پہلے سے موجود یا حراست کے دوران پیدا ہونے والی سنگین طبی حالتوں کو نظر انداز کیے جانے کی اطلاعات بھی جمع کیں۔

صحافیوں نے غیر صحت بخش رہائشی حالات، مسلسل خوراک کی کمی اور خواتین کے لیے صفائی ستھرائی کی اشیا کی مکمل عدم دستیابی کا بھی ذکر کیا۔ کئی صحافیوں نے طبی عملے سے مدد لینے سے بھی گریز کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض ڈاکٹر خود بدسلوکی کرتے یا اسے برداشت کرتے تھے۔

عبدالمحسن شلالدہ نے بتایا کہ جلتے ہوئے سگریٹ اس کے برہنہ جسم پر بجھائے گئے۔ جب اس نے ایک ڈاکٹر کو اس بدسلوکی کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر نے جواب دیا:

''ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ نہیں۔''

ایک دوسرے صحافی نے ایک ڈاکٹر کا ردِعمل یاد کرتے ہوئے بتایا کہ شدید زخمی شخص کے بارے میں ڈاکٹر نے کہا:

''تم نے مجھے کیوں بلایا، اگر یہ ابھی تک مرا نہیں؟''

بھوک: جسم کو کمزور کرنے سے آگے، ذہن توڑنے کا ذریعہ؟

بین الاقوامی انسانی قانون حراستی حالات میں سزا یا دباؤ کے ایک طریقے کے طور پر بھوک کو استعمال کرنے سے منع کرتا ہے۔

CPJ کے مطابق صحافیوں کی شہادتوں میں خوراک سے محرومی محض جسمانی تکلیف نہیں بلکہ زیرِ حراست افراد کو نفسیاتی طور پر توڑنے کے ایک ذریعے کے طور پر بھی سامنے آئی۔ 59 میں سے 55 صحافیوں نے شدید بھوک یا غذائی قلت کی اطلاع دی۔

CPJ نے صحافیوں کے حراست سے پہلے اور بعد کے بتائے گئے وزن کا موازنہ کیا اور حساب لگایا کہ اس گروپ میں اوسطاً 23.5 کلوگرام، یعنی 54 پاؤنڈ، وزن کم ہوا۔

CPJ کو فراہم کی گئی تصاویر میں کئی صحافیوں کے چہروں، جسموں اور مجموعی حالت میں نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے، دھنستے ہوئے گال، نمایاں پسلیاں اور انتہائی کمزور جسم۔

صحافی احمد شقورہ نے بتایا کہ کتزیعوت اور الجلمہ جیلوں میں 14 ماہ کی حراست کے دوران اس کا 54 کلوگرام، یعنی 119 پاؤنڈ، وزن کم ہو گیا۔

دیگر صحافیوں نے بتایا کہ انہیں پھپھوندی لگی روٹی اور سڑی ہوئی خوراک پر گزارا کرنا پڑا۔ بعض نے خوراک کی مقدار کو بھی انتہائی ناکافی قرار دیا۔

صحافی اشواق ایاد نے بتایا کہ اس کا 15 کلوگرام سے زیادہ وزن کم ہو گیا اور پہلے سے موجود طبی حالت کے لیے مناسب خوراک اور علاج نہ ملنے کے باعث اسے خون کی قے آنا شروع ہو گئی۔ سردیوں میں لباس کی کمی نے صورتحال کو مزید دشوار کر دیا۔

صحافی عبدالحمید حمدونہ نے بتایا کہ اس نے ایک شرٹ حاصل کرنے کے لیے اپنا کھانا دے دیا۔

اسرائیل کے قومی سلامتی کے وزیر بن گویر نے جولائی 2025 میں کہا تھا:

''میں یہاں اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہوں کہ 'دہشت گردوں' کو خوراک کی کم سے کم مقدار میں سے بھی کم سے کم مقدار ملے۔''

اگرچہ اسرائیل کی سپریم کورٹ نے ستمبر میں فیصلہ دیا کہ جان بوجھ کر قیدیوں کو بھوکا رکھنا غیر قانونی ہے، تاہم حالیہ مہینوں میں رہا ہونے والے صحافیوں نے بتایا کہ انہیں حالات میں کوئی نمایاں بہتری نظر نہیں آئی۔

جنسی تشدد: تذلیل اور خوف کا ایک اور ہتھیار

اسرائیلی جیلوں میں فلسطینی قیدیوں کے خلاف جنسی تشدد کے الزامات دیگر انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی دستاویزی شکل میں پیش کیے ہیں۔ CPJ کی جمع کردہ شہادتوں میں بھی جنسی تشدد بار بار سامنے آیا۔ صحافیوں کے مطابق بعض حملوں کا مقصد صرف جسمانی نقصان پہنچانا نہیں بلکہ انہیں ذلیل کرنا، خوف زدہ کرنا اور ایسا نفسیاتی زخم دینا تھا جو طویل عرصے تک باقی رہے۔

دسمبر 2025 میں جرمن صحافی اینہ لِڈ ٹکے، جنہیں غزہ جانے والے بحری قافلے سے حراست میں لیا گیا تھا، نے الزام عائد کیا کہ اسرائیلی فوجیوں نے دورانِ حراست انہیں ریپ کیا۔ اطالوی صحافی ونچنزو فلّو نے اور آسٹریلوی کارکن سوریا میک ایون نے بھی اسی نوعیت کے الزامات عائد کیے۔ 59 فلسطینی صحافیوں میں سے دو نے CPJ کو بتایا کہ انہیں حراست کے دوران ریپ کیا گیا۔

صحافی سامی الساعی نے بتایا کہ اسے مجیدو جیل میں ایک چھوٹے سے سیل میں لے جایا گیا، جہاں فوجیوں نے اس کی پتلون اور زیر جامہ اتارا اور لاٹھیوں اور دیگر اشیا کے ذریعے اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی۔

الساعی کے مطابق اس نے حراست کے دوران کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا، سوائے دو ایسے بزرگ قیدیوں کے جو 25 سال سے جیل میں تھے۔

اس نے بتایا:

''میں تقریباً دو ماہ تک خاموش رہا، لیکن بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کے بارے میں بات کروں۔''

الساعی نے بتایا کہ وہ شدید نفسیاتی اذیت کا شکار ہو گیا تھا اور دیگر قیدیوں کی شہادتیں سننے کے بعد ہی اس کیفیت سے باہر آنے میں کامیاب ہوا۔

ایک اور صحافی اسامہ السید نے بتایا کہ سدی تیمان میں اسے اور دیگر قیدیوں کو برہنہ کیا گیا اور تربیت یافتہ کتوں سے ان پر حملہ کروایا گیا۔ اس نے اس واقعے کو ریپ قرار دیا اور کہا کہ فوجی اس حملے کی ویڈیو بناتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

مجموعی طور پر CPJ نے:

17 صحافیوں کی ایسی شہادتیں دستاویزی شکل میں جمع کیں جن میں جنسی تشدد کا ذکر تھا۔

مزید 19 صحافیوں نے ذلت آمیز جسمانی تلاشیوں کی تفصیل بیان کی۔

مبینہ کارروائیوں میں اعضائے تناسل پر حملے، اشیا کے ذریعے جبری دخول کی کوشش، جبری برہنگی اور اس کی ویڈیو بنانا، ریپ کی دھمکیاں اور جنسی نوعیت کے دباؤ کے دیگر طریقے شامل تھے۔

صحافت چھوڑنے کی دھمکیاں

متعدد صحافیوں نے CPJ کو بتایا کہ انہیں ان کے صحافتی کام کی وجہ سے براہِ راست نشانہ بنایا گیا۔

محمد بدر کے مطابق تفتیش کاروں نے کئی گھنٹوں تک اس کی صحافت کے بارے میں سوالات کیے اور اسے کہا گیا کہ یا تو مخبر بن جائے یا مزید عرصہ جیل میں رہے۔

صحافی امین برکہ نے بتایا کہ اس سے قطر سے وابستہ الجزیرہ کے ساتھ اس کے کام کے بارے میں بار بار پوچھ گچھ کی گئی اور اس کے خاندان کو تشدد کی دھمکیاں دی گئیں۔

اس نے بتایا:

"ایک اسرائیلی فوجی نے مجھے لفظ بہ لفظ عربی میں کہا کہ الجزیرہ کے نمائندے وائل الدحدوح نے ہماری بات نہیں مانی اور غزہ میں موجود رہا، اس لیے ہم نے اس کے خاندان کو قتل کر دیا، اور تمہارے خاندان کو بھی قتل کر دیں گے۔"

صحافی محمد الاطرش نے بتایا کہ جیل سے رہائی سے قبل اسے صحافت چھوڑنے کی تنبیہ کی گئی۔

اس کے مطابق اسے کہا گیا:

"اگر تم سوشل میڈیا پر صرف 'صبح بخیر' بھی لکھو گے تو ہمیں پتا چل جائے گا۔"

اسامہ السید نے بتایا کہ دورانِ حراست فوجی اسے "الجزیرہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے مطابق جب اس نے بتایا کہ وہ صحافی ہے تو اس پر تشدد مزید بڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ گرفتاری کے دوران اس نے فوجیوں سے کہا: "میں صحافی ہوں۔" اور اسی کے بعد اسے شدید مار پیٹ کا نشانہ بنایا گیا۔

شادی ابو سیدو نے، جسے فلم بندی کے دوران گرفتار کیا گیا تھا، بتایا کہ اسے گرفتار کرنے والے فوجی نے کہا:

"تم تل ابیب میں صحافت کا مطلب سیکھو گے۔"

جواب دہی کہاں ہے؟

CPJ نے اسرائیلی فوج سے صحافیوں کی جانب سے عائد کیے گئے مخصوص الزامات پر بارہا تبصرہ طلب کیا، لیکن فوج نے ان مخصوص الزامات پر براہِ راست جواب نہیں دیا۔ فوج نے CPJ سے شناختی نمبروں اور جغرافیائی نقاط کا مطالبہ کیا، تاہم CPJ ایسے اعداد و شمار جمع یا فراہم نہیں کرتا۔

جب جسمانی اور جنسی تشدد، بھوک سے رکھنے، تحقیقات اور جواب دہی کے عمل سے متعلق الزامات پر سوال کیا گیا تو فوجی ترجمان نے کہا:

"زیرِ حراست افراد کے ساتھ بین الاقوامی قانون کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔"

ترجمان نے مزید کہا کہ اسرائیلی مسلح افواج نے:

"کبھی بھی اور نہ ہی کبھی جان بوجھ کر صحافیوں کو نشانہ بنایا ہے۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ پروٹوکول کی کسی بھی خلاف ورزی کا جائزہ لیا جائے گا۔

CPJ نے اسرائیلی جیل سروس (IPS) سے بھی رابطہ کیا۔

IPS نے جواب دیا:

"تمام قیدیوں کو قانون کے مطابق حراست میں رکھا جاتا ہے" اور "تمام بنیادی حقوق پیشہ ورانہ تربیت یافتہ جیل محافظوں کی جانب سے مکمل طور پر برقرار رکھے جاتے ہیں۔"

جیل سروس نے کہا کہ اسے بیان کردہ دعووں کا علم نہیں اور اس کے علم کے مطابق: "ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔" تاہم IPS نے یہ بھی کہا کہ قیدیوں اور زیرِ حراست افراد کو شکایت درج کرانے کا حق حاصل ہے اور سرکاری حکام ان شکایات کی مکمل جانچ کریں گے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق، تاہم، یہ شکایتی نظام بڑی حد تک غیر مؤثر ہیں اور بعض معاملات میں شکایت کرنے والے قیدیوں کو مزید نقصان کا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔

صحافی فرح ابو عیاش، جو بدستور قید ہیں، نے اپنے وکیل کے ذریعے جاری ہونے والی شہادت میں بتایا کہ گرفتاری کے وقت ایک فوجی نے اسے تھپڑ مارا اور اسرائیلی پرچم کو بوسہ دینے پر مجبور کیا۔ اس کے مطابق اس نے متعلقہ فوجی کے خلاف شکایت درج کرائی، لیکن اس کے بعد جیل کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ اسے 50 دن سے زیادہ قیدِ تنہائی میں رکھا گیا اور معمول کے مطابق مار پیٹ اور بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔

CPJ نے اسرائیلی جیل سروس سے ابو عیاش کی شکایت کے بارے میں مزید معلومات طلب کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

وکیلوں تک رسائی بھی محدود

صحافیوں نے بڑے پیمانے پر یہ بھی بتایا کہ انہیں اپنے وکیلوں تک مناسب رسائی حاصل نہیں تھی۔ کم از کم 21 صحافیوں نے بتایا کہ انہیں مناسب قانونی نمائندگی سے محروم رکھا گیا۔ ان میں سے 17 نے کہا کہ انہیں کسی وکیل سے بات کرنے کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ مزید چار صحافیوں نے بتایا کہ انہیں صرف ایک مرتبہ، چند منٹ کے لیے اور ایسی جگہ وکیل سے ملنے دیا گیا جہاں رازداری موجود نہیں تھی۔

اپریل 2024 میں CPJ اور اقوام متحدہ کے دفتر برائے انسانی حقوق کے درمیان ہونے والی خط و کتابت میں بھی بتایا گیا کہ بعض زیرِ حراست صحافیوں کو وکیلوں اور خاندان کے افراد تک رسائی سے محروم رکھا گیا، جس کے باعث وہ انتظامی حراست کے دوران تنہائی کا شکار رہے اور ان کی قانونی نمائندگی متاثر ہوئی۔

اگرچہ قانونی نمائندگی باضابطہ طور پر فلسطینی اتھارٹی کے زیرِ انتظام کمیشن آف ڈیٹینیز افیئرز (CDA) کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے، لیکن یہ نظام شدید دباؤ کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے دفتر کے مطابق انتظامی حراست کے مقدمات کے لیے صرف چار وکیل مقرر تھے، اور ہر وکیل کے ذمے تقریباً 900 زیرِ حراست افراد کے مقدمات تھے۔

ایک وسیع تر نظام؟

اسرائیلی جیلوں میں فلسطینی قیدیوں کے خلاف تشدد، بدسلوکی اور دیگر زیادتیوں کے الزامات نئے نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ صرف صحافیوں تک محدود بھی نہیں۔ اسرائیلی اور بین

الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیمیں کئی برس سے شہری فلسطینی زیرِ حراست افراد، جن میں صحافی بھی شامل ہیں، کے خلاف بدسلوکی کے مختلف نمونوں کو دستاویزی شکل دیتی رہی ہیں۔

فزیشنز فار ہیومن رائٹس اسرائیل کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق تنظیم نے اسرائیلی حراست میں کم از کم 90 فلسطینی اموات کو دستاویزی شکل دی، جن میں تنظیم کے مطابق ایسے واقعات بھی شامل ہیں جو تشدد کے قانونی معیار اور طبی غفلت کے دائرے میں آتے ہیں۔

2025 کے آغاز میں سدی تیمان حراستی کیمپ کی نگرانی کی ایک لیک شدہ ویڈیو سامنے آئی، جس میں بظاہر زیرِ حراست افراد کے ساتھ فوجیوں کی جانب سے جنسی زیادتی دکھائی دیتی تھی۔ اس ویڈیو کے منظرِ عام پر آنے کے بعد اسرائیل میں ایک بڑا عوامی تنازع پیدا ہوا۔ یہ ویڈیو اسرائیلی صحافی گائے پیلیگ نے نشر کی تھی، جس کے بعد اسے مبینہ طور پر دھمکیوں اور ہراسانی کا سامنا کرنا پڑا۔

CPJ کی جانب سے جمع کی گئی شہادتیں اس کے مطابق اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ گزشتہ دو برسوں کے دوران فلسطینی صحافیوں کو پیش آنے والے واقعات محض چند انفرادی اہلکاروں کے اقدامات تک محدود نہیں تھے، بلکہ حراست کے ایسے طریقۂ کار کا حصہ دکھائی دیتے ہیں جس میں تشدد، تذلیل اور محرومی کے ذریعے صحافیوں کو خوف زدہ کرنا اور غزہ و مغربی کنارے سے رپورٹنگ کو دبانا شامل ہے۔

CPJ کی علاقائی ڈائریکٹر سارا قدح نے ایک بار پھر کہا:

''یہ الگ تھلگ واقعات نہیں ہیں۔ درجنوں واقعات کے ذریعے CPJ نے بدسلوکی کے ایک مسلسل دہرائے جانے والے سلسلے کو دستاویزی شکل دی ہے، مار پیٹ سے لے کر بھوک، جنسی تشدد اور طبی غفلت تک، جس کا نشانہ صحافیوں کو ان کے کام کی وجہ سے بنایا گیا۔ یہ واقعات صحافیوں کو خوف زدہ اور خاموش کرنے اور ان کی گواہی دینے کی صلاحیت کو ختم کرنے کی ایک دانستہ حکمتِ عملی کو ظاہر کرتے ہیں۔ عالمی برادری کی مسلسل خاموشی صرف اس صورتحال کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔''

دستاویزی شکل میں سامنے آنے والی بدسلوکی کا پیمانہ، یکسانیت اور شدت بین الاقوامی قانون کے تحت سنگین سوالات اٹھاتی ہے۔ ان میں اقوام متحدہ کے کنونشن برائے انسدادِ تشدد کی ممکنہ خلاف ورزیاں اور جنیوا کنونشنز کے آرٹیکل 79 کے تحت صحافیوں کو حاصل تحفظات شامل ہیں۔

CPJ کے مطابق اس چکر کو ختم کرنے کے لیے صرف ان 30 فلسطینی صحافیوں کی رہائی کافی نہیں جو اس رپورٹ کے مرتب کیے جانے کے وقت اسرائیلی جیلوں میں موجود تھے اور جنہیں اس رپورٹ کے انٹرویوز میں شامل نہیں کیا گیا۔

ان 30 میں سے 25 کے خلاف کوئی الزامات ظاہر نہیں کیے گئے۔

اسرائیل۔غزہ جنگ کے سیاسی، فوجی اور انسانی اثرات اپنی جگہ، لیکن یہ وسیع تر صورتحال فلسطینی صحافیوں کو درپیش مخصوص خطرات سے نمٹنے کی ضرورت کو ختم نہیں کرتی۔ CPJ کے مطابق اسرائیل کو چاہیے کہ اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندوں سمیت آزاد بین الاقوامی مبصرین کو حراستی مراکز تک رسائی دے اور تمام الزامات کی شفاف اور غیر جانب دار تحقیقات کرے۔ تنظیم کا کہنا ہے کہ عالمی برادری کو جواب دہی کے لیے دباؤ ڈالنا چاہیے اور یہ یقینی بنانا چاہیے کہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزیوں کو سزا کے بغیر نہ چھوڑا جائے اور صحافت کی قیمت ناقابلِ برداشت نہ بنے۔

طریقۂ کار: یہ رپورٹ CPJ کی تحقیقی ٹیم کی جانب سے اکتوبر 2023 سے جنوری 2026 کے درمیان اسرائیلی حراست سے رہا ہونے والے 59 فلسطینی صحافیوں کے ساتھ کیے گئے تفصیلی انٹرویوز پر مبنی ہے۔ انٹرویوز فون اور آن لائن پیغام رسانی کی خدمات کے ذریعے کیے گئے اور انہیں لفظ بہ لفظ تحریر کیا گیا۔

شرکاء سے معیاری سوالات پوچھے گئے جن میں:

گرفتاری کے حالات	حراست کے حالات	قانونی حیثیت
مبینہ بدسلوکی	صحت پر پڑنے والے اثرات	

شامل تھے۔ انٹرویو دینے والوں کو گمنامی کی پیشکش کی گئی۔ جہاں دستیاب تھے، انہوں نے تصاویر، طبی رپورٹس اور قانونی دستاویزات سمیت معاون شواہد بھی فراہم کیے۔ بدسلوکی اور تشدد کے دعووں کا مختلف شہادتوں میں سامنے آنے والے نمونوں کی بنیاد پر تجزیہ کیا گیا۔ ان کا تقابل عوامی طور پر دستیاب رپورٹنگ اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی سابقہ دستاویزات سے بھی کیا گیا۔

CPJ نے جمع کی گئی معلومات کو متعدد ذرائع سے جانچا۔

جہاں ممکن ہوا، شہادتوں کو انٹرویو دینے والوں کی فراہم کردہ دستاویزات، میڈیا رپورٹس، انسانی حقوق کی سابقہ دستاویزات اور محدود طبی ریکارڈ سمیت آزاد عوامی ذرائع سے کراس چیک کیا گیا۔ رپورٹ میں اسرائیلی حکام سے جوابِ حق (Right of Response) کے لیے کیے گئے رابطوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ کن معاملات میں اسرائیلی حکام نے جواب دیا اور کن میں کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ یہ طریقۂ کار معلومات کے منظم انداز میں جمع کیے جانے اور ان کی جانچ میں شفافیت فراہم کرتا ہے، تاہم CPJ نے محدود رسائی، سیکیورٹی خدشات اور دستاویزی شواہد میں موجود خلا کو بھی رپورٹ کی حدود کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

CPJ نے واضح کیا ہے کہ وہ اس رپورٹ میں ''تشدد'' کی اصطلاح اس زبان کی عکاسی کے لیے استعمال کرتا ہے جو زیرِ حراست افراد اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے استعمال کی۔ CPJ خود کسی قانونی خلاف ورزی کا حتمی قانونی فیصلہ نہیں کرتا بلکہ دستاویزی شہادتوں، سامنے آنے والے نمونوں اور ماہرین کے جائزوں کو رپورٹ کرتا ہے۔

راما صانع نومبر 2025 سے CPJ کی لیونٹ کے لیے محقق ہیں۔ وہ عمان، اردن میں مقیم تیسری نسل کی فلسطینی پناہ گزین ہیں۔ انہوں نے کنگز کالج لندن سے وار اسٹڈیز میں ماسٹرز اور SOAS، یونیورسٹی آف لندن سے سیاست اور معاشیات میں بی اے کیا ہے۔ علاقے کی سیاسی جغرافیہ اور تاریخ پر علمی و پیشہ ورانہ توجہ کے ساتھ انہوں نے مختلف آزاد خبر رساں اور میڈیا اداروں کے لیے فری لانس معاون، سینئر ایڈیٹر، محقق اور پروڈیوسر کے طور پر کام کیا ہے۔ راما نے مختلف میڈیا یا پلیٹ فارمز پر انگریزی اور عربی زبانوں میں کام کیا ہے اور حقوقِ نسواں، کوئیر حقوق اور مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کرنے والے نچلی سطح کے گروہوں کے ساتھ قریبی تعاون کیا ہے۔

محمد عثمان اگست 2024 میں CPJ میں مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے محقق کے طور پر شامل ہوئے، جہاں ان کی توجہ غزہ اور مغربی کنارے پر ہے۔ وہ 2009 سے میڈیا کے شعبے میں کام کر رہے ہیں اور تحقیقاتی صحافت میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ علاقائی آزادیٔ صحافت کے گروپ SKeyes کے لیے بھی رپورٹنگ کر چکے ہیں۔

خلود مصالحہ اسرائیل اور مقبوضہ فلسطینی علاقوں کے حوالے سے CPJ کی مشیر ہیں اور آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ اظہار کے معاملات میں کئی سالہ تجربہ رکھنے والی محقق ہیں۔

تجزیہ: جوزف مسعد

مغربی منافقت اور مغربی کنارے کے اسرائیلی آبادکار: اصل مجرم کون؟

مشرقِ وسطیٰ کے خونچکاں معرکے اور مسئلہ فلسطین کے تناظر میں مغرب کا دوہرا معیار اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہا۔ مظلوم فلسطینیوں پر دہائیوں سے جاری ظلم و جبر اور حالیہ نسل کشی کی سرپرستی کرنے والے مغربی ایوان، اب اچانک ''انصاف کے علمدار'' بن کر ابھرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ پورا ہاتھی نظرانداز کر کے صرف مچھر مارنے کی اس مغربی سیاست میں اصل مجرم یعنی صیہونی ریاست اور اس کی درندہ صفت فوج کو صاف بچا کر، تمام تر ملبہ محض چند ''آبادکاروں'' پر ڈالا جا رہا ہے۔ علامتی پابندیوں اور بائیکاٹ کا یہ ڈرامہ دراصل عالمی برادری کی توجہ اصل مسئلے سے ہٹانے کا ایک اور شاطرانہ ہتھکنڈا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممتاز سیاسی تجزیہ نگار اور پروفیسر جوزف مسعد کا یہ فکرانگیز مضمون مغرب کی اسی عیاری اور صیہونی ریاست کی پشت پناہی کی قلعی کھولتا ہے۔

مغربی ایوانوں میں مقبوضہ مغربی کنارے کے یہودی آبادکاروں کی شدید اور سخت مذمت کا سلسلہ مسلسل جاری ہے (اگرچہ مشرقی یروشلم اور جولان کی پہاڑیوں کے آبادکاروں کو اس سے استثنیٰ حاصل ہے)۔ حال ہی میں برطانیہ، فرانس اور کینیڈا جو غزہ میں اسرائیلی نسل کشی کے اہم سرپرستوں میں شمار ہوتے ہیں نے مقبوضہ مغربی کنارے کی یہودی بستیوں سے تجارت پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اس طرح یہ ممالک بالآخر اس بائیکاٹ کا حصہ بن گئے ہیں جو اسپین، آئرلینڈ اور نسل کشی کے مخالف دیگر ممالک نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ ان غیرقانونی بستیوں کی مصنوعات کی تجارت خود بین الاقوامی قانون کی واضح خلاف ورزی تھی۔

دوسری طرف شدید متعصب اور شدت پسند عیسائی صیہونی، سابق امریکی سفیر مائیک ہکابی نے بھی مغربی کنارے کا دورہ کر کے آبادکاروں کے تشدد کو ''دہشت گردی'' قرار دیا لیکن وہ یورپی بائیکاٹ کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ''یہودی عوام کے ساتھ تعصب'' قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے برطانوی وزیر خارجہ ایڈ ملی بینڈ (جو خود یہودی اور صیہونی ہیں) پر ''یہود دشمنی'' کا الزام بھی عائد کیا۔

ادھر صورتحال یہ ہے کہ یورپی ممالک اور کینیڈا جو مغربی کنارے کی غیرقانونی بستیوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں، وہ خود یہودی آبادکار ریاست یعنی اسرائیل سے مصنوعات کی درآمدات بدستور جاری رکھیں گے۔ اسرائیل نے اس پر بھی اپنی روایتی فرعونیت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے 11 برطانوی ارکانِ پارلیمنٹ کے اسرائیلی کنٹرول والے علاقوں میں داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے اور یروشلم میں برطانوی قونصل خانہ بند کر دیا ہے۔

آخر اس سب کا مقصد کیا ہے؟ یورپی اور کینیڈین اچانک مغربی کنارے کے یہودی آبادکاروں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ ان آبادکاروں نے ایسا کیا بھیانک جرم کر دیا ہے جو اس قدر شدید مذمت اور بائیکاٹ کا باعث بن رہا ہے؟

بائیکاٹ کرنے والے ممالک آبادکاروں کے بڑھتے ہوئے تشدد کو اس کا جواز بناتے ہیں (جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہونے والا تشدد بائیکاٹ کے لیے کافی نہیں تھا)۔ وہ اس بائیکاٹ کی بنیاد بین الاقوامی عدالتِ انصاف (ICJ) کی 2024ء کی اس مشورتی رائے پر بھی رکھتے ہیں، جس میں مقبوضہ فلسطینی علاقوں، مغربی کنارے، مشرقی یروشلم اور غزہ میں اسرائیل کی مسلسل موجودگی کو غیرقانونی قرار دیا گیا تھا۔

تاہم، حقیقت یہ ہے کہ مشرقی یروشلم، غزہ، مغربی کنارے اور شام کے جولان کی پہاڑیوں میں اسرائیلی قبضہ اور یہودی بستیوں کو آدھی صدی سے زائد عرصے سے بین الاقوامی قانون کے منافی قرار دیا جا چکا ہے۔ نومبر 1967ء میں اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد 242 نے جنگ کے ذریعے علاقے حاصل کرنے کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہوئے اسی سال مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی مسلح افواج کے انخلا کا مطالبہ کیا تھا۔

مارچ 1979ء کی قرارداد 446 میں ان بستیوں کو قانونی طور پر کالعدم قرار دیا گیا، جبکہ مارچ 1980ء کی قرارداد 465 نے اسرائیل کی استعمارکاری پالیسی کو چوتھے جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا۔ یہاں تک کہ برطانیہ اور فرانس دونوں نے قرارداد 242 اور 465 کے حق میں ووٹ دیا تھا، جبکہ فرانس نے قرارداد 446 کے حق میں اور برطانیہ نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ 2024ء کی بین الاقوامی عدالتِ انصاف کی رائے نے صرف اقوامِ متحدہ کی ان قراردادوں کو مزید مضبوط اور وسیع کیا، لیکن بستیوں کی غیرقانونی حیثیت پر کوئی نیا موڑ نہیں دیا۔

علاوہ ازیں اسرائیلی فوج کی جانب سے مغربی کنارے کے فلسطینیوں کے خلاف کیا

جانے والا تشدد (غزہ اور مشرقی یروشلم کے فلسطینیوں کو تو چھوڑ ہی دیں) ان بدنام زمانہ یہودی آبادکاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اسرائیلی فوج نے 1967ء میں 3 لاکھ فلسطینیوں کو بے دخل کیا اور تب سے اب تک ہزاروں کو شہید کر چکی ہے، جبکہ آبادکاروں نے زیادہ سے زیادہ درجنوں افراد کو شہید اور چند سو کو بے دخل کیا ہے۔ اس کے باوجود اسرائیل یا کم از کم اس کی فوج کے بائیکاٹ کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا، جس سے بندہ اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسرائیلی فوج کا تشدد کوئی سنگین جرم نہیں جو سزا کا مستوجب ہو۔

آخر یہ غریب آبادکار غیر منصفانہ طور پر کیوں نتائج بھگت رہے ہیں، جبکہ وہ اس عظیم الشان ظلم و بربریت میں محض چھوٹے پیادے ہیں جو صیہونی تحریک، اسرائیلی ریاست اور اس کی ملٹری نے 1880ء کی دہائی سے فلسطینی عوام پر ڈھایا ہے؟

بائبل کے دعوے:۔ مئی 1948ء سے پہلے عسکری گروہوں میں منظم یہودی آبادکاروں اور اس کے بعد اسرائیلی فوج نے نہ صرف 1947ء سے 1949ء کی صیہونی فتح کے دوران تقریباً 8 لاکھ مقامی فلسطینیوں کو بے گھر کیا اور 13,000 کو شہید کیا، بل کہ وہ بائیولوجیکل وار فیر (حیاتیاتی جنگ) میں بھی ملوث رہے۔ انہوں نے فلسطینی دیہاتوں کے کنوؤں میں ٹائفائیڈ اور پیچش کے بیکٹیریا ملا کر انہیں زہریلا بنایا، یہ ایک ایسا جنگی جرم تھا جس کی نگرانی خود آبادکاروں کے قائد ڈیوڈ بن گوریان نے کی تھی۔

اگر آج کے مغربی کنارے کے یہودی آبادکار اپنے قبضے کی وضاحت کے لیے بائبل کا حوالہ دیتے ہیں، تو اسرائیل کے نام نہاد ''سیکولر'' یہودی آبادکار رہنماؤں نے بھی 1967ء سے پہلے اور بعد میں یہی کچھ کیا۔ یہ ڈیوڈ بن گوریان ہی تھے جو بار بار یاد دلاتے نہیں تھکتے تھے کہ ''خدا نے ہم سے (فلسطین کا) وعدہ کیا ہے۔'' یہ بن گوریان ہی تھے جنہوں نے 1956ء میں عربوں کو ''عمالقہ'' (بائبل کی ایک دشمن قوم) قرار دیا۔ اسرائیلی فوج نے بھی 1948ء میں فلسطینی کنوؤں کو زہر دینے کے اپنے آپریشن کا نام بائبل کی ایک آیت سے ''آپریشن کاسٹ دی بریڈ'' (Operation Cast Thy Bread) رکھا۔

1948ء میں بائبل کی شخصیات کے نام پر رکھے گئے اسرائیلی عسکری آپریشنز میں ''آپریشن نحشون''، ''آپریشن یفتاح'' اور ''آپریشن یوآو'' وغیرہ شامل تھے۔ اس کی فوج آج بھی بائبل سے آپریشنز کے نام مستعار لیتی ہے، جیسے ایران کے خلاف 2025ء کی جنگ کے لیے ''آپریشن رائزنگ لائن'' اور غزہ کے فلسطینیوں پر 2012ء کی جنگ کے لیے ''پیلر آف ڈیفنس''۔

حتیٰ کہ اسرائیل کے ہتھیاروں کے نام بھی بائبل کے ناموں پر ہیں، جن میں ''جیریکو'' بیلسٹک میزائل اور ''ڈیوڈز سلنگ'' (کمندِ داؤدی) میزائل شامل ہیں۔ اس کے ٹینکوں کا نام ''مرکاوہ'' (جس کا مطلب رتھ ہے) حزقی ایل کی کتاب کا ایک حوالہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ آبادکاروں نے 2000ء کی دہائی میں فلسطینی دیہاتوں کے کنوؤں اور پانی کے ذخائر میں استعمال شدہ نیپیز اور دیگر آلودہ اشیاء پھینک کر انہیں قصداً آلودہ کیا۔ لیکن انہوں نے صیہونی لیبارٹریوں میں تیار کردہ حیاتیاتی ایجنٹوں سے پانی کو زہریلا نہیں کیا جیسا کہ بن گوریان نے 1948ء میں کیا تھا۔

آج کے یہودی آبادکار اگرچہ چھوٹے پیمانے پر مظالم ڈھاتے ہیں، لیکن صیہونی بانیوں نے 1948ء میں ایسے خوفناک قتلِ عام کیے اور غزہ میں جاری موجودہ نسل کشی تو ایسی ہے جس کی مثال ان کم پر تشدد آبادکاروں کے عمل میں نہیں ملتی۔

1948ء سے پہلے اور بعد کے اسرائیل کے یہودی آبادکاروں کی طرح 1967ء کے بعد کے یہودی آبادکار، خاص طور پر امریکی آبادکار، بن گوریان جیسے ہی بائبل کے دعوے کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں ''یہودیہ اور سامریہ'' کا علاقہ دیا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کوئی نیا دعویٰ پیش کرتے۔

انتخابی سزا (منافقت):۔ اسرائیلی فوج 7 اکتوبر 2023ء کو غزہ کے فلسطینیوں کے خلاف نسل کشی شروع کرنے کے بعد سے اب تک 1,200 سے زائد مغربی کنارے کے فلسطینیوں کو شہید کر چکی ہے، جن میں سے چوتھائی حصہ بچے ہیں۔

صرف 2026ء میں، اسرائیلی فوج اور یہودی آبادکاروں نے مغربی کنارے میں تقریباً 100 فلسطینیوں کو شہید کیا ہے، جن میں 19 بچے شامل ہیں۔ ان میں سے 23 افراد آبادکاروں کے حملوں میں شہید ہوئے۔ اس دوران، اسرائیلی فوج نے پچھلے کچھ مہینوں میں ہی مغربی کنارے کے کئی پناہ گزین کیمپوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ان کے رہائشیوں کو بے دخل کر دیا ہے۔

یہ اسرائیلی حکومت اور فوج ہے، نہ کہ آبادکار، جنہوں نے دو ریاستی حل کے امکان کو ختم کیا ہے، جو یورپیوں اور کینیڈینز کو بہت عزیز تھا، جنہوں نے ان بستیوں کے بائیکاٹ کو اسی ''حل'' کا دفاع قرار دیا تھا۔

اسرائیلی توسیع پسندی اور نوآبادیات کے پیچھے اصل فیصلہ ساز حکومت اور فوج ہی ہیں۔ آبادکار محض ان کے پیادے ہیں، پھر بھی بائیکاٹ کرنے والوں کی طرف سے ان ہی کو غیر منصفانہ طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

یہ ایک سنگین ناانصافی ہے، جس کی مخالفت کی جانی چاہیے اور اسے فوری طور پر درست کیا جانا چاہیے۔

اگر اسرائیل کے قبضے اور نسل کشی کے یورپی و کینیڈین سرپرست اور وہ لوگ جو ان دونوں کی مخالفت کرتے ہیں، واقعی منصفانہ بننا چاہتے ہیں اور اسرائیل کے یہودی برتری کے نظام اور فلسطینی سرزمین پر اس کے قبضے کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو سزا ریاستِ اسرائیل کو ملنی چاہیے، نہ کہ چند بے بس آبادکاروں کو جو اس ریاست کی کامل سرپرستی کے بغیر بالکل بے بس ہوں گے۔

12 ممالک کی طرف سے ان بستیوں کے ساتھ تجارت پر پابندی کے فیصلے کا اس یہودی آبادکار ریاست پر کوئی معاشی اثر نہیں پڑے گا اور نہ ہی یہ یہودی آبادکاری کو روک سکے گا۔ اسرائیل کے ساتھ ان ممالک کی تجارتی حجم کے مقابلے میں ان بستیوں کے ساتھ تجارت کی مقدار چیونٹی کے برابر ہے۔ صرف اس نسل پرست اسرائیلی ریاست اور اس کے تمام اداروں کا مکمل اور حتمی بائیکاٹ ہی ایسے نتائج حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی بات ان آبادکاروں کے ساتھ بھی انصاف ہوگی۔

جوزف مسعد کا یہ تجزیہ مغرب کے اس منافقانہ رویے کو بے نقاب کرتا ہے جہاں اصل مجرم (ریاستِ اسرائیل اور اس کی افواج) کو کھلی چھوٹ دے کر چند آبادکاروں پر علامتی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ دنیا کے لیے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب تک اسرائیل کی غاصب ریاست کو اس کے مظالم اور نسل کشی کا حساب دینے پر مجبور نہیں کیا جاتا اور اس کا مکمل سیاسی، معاشی اور سفارتی بائیکاٹ نہیں ہوتا، تب تک فلسطین میں امن کا قیام ناممکن ہے۔ مغربی دنیا کا یہ نیم دلی کا اقدام محض دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔

نفرت کی سیاست اور ووٹ کا کھیل

اسرائیلی انتخابات میں فلسطینیوں کی جبری ہجرت کا زہریلا کارڈ

غزہ کے کھنڈرات سے لے کر مغربی کنارے کے الحاق تک کس طرح انتہا پسند صہیونی جماعتیں فلسطینیوں کی جبری ہجرت کو اقتدار کی مسند کے حصول کا سب سے بڑا انتخابی حربہ بنا رہی ہیں اور عالمی ضمیر کی خاموشی اس المیے کو کیسے ہوا دے رہی ہے؟

تاریخ کے کسی بھی سیاہ ترین باب کا مطالعہ کر لیں آپ کو ایسے شواہد شاذ و نادر ہی ملیں گے جہاں انسانی المیوں کو اتنی بے رحمی اور ڈھٹائی کے ساتھ انتخابی مہمات کا ایندھن بنایا گیا ہو جتنا کہ قابض اسرائیل کی سیاسی تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ جب بھی صہیونی ایوانوں میں انتخابی بگل بجتا ہے فلسطینیوں کی روح، ان کے جسم، ان کے اجڑے ہوئے گھر اور ان کی لہولہان دھرتی کو سیاست کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی اچانک رونما ہونے والا حادثہ نہیں، بلکہ ایک طویل المدتی اور سوچی سمجھی پالیسی کا تسلسل ہے جس کے تحت فلسطینیوں کی جبری بے دخلی اور جبری ہجرت کو ہمیشہ دائیں بازو کی انتہا پسند صہیونی سیاسی جماعتوں نے اقتدار کی سیڑھی کے طور پر استعمال کیا ہے۔

مگر اکتوبر 2026ء کے متوقع اسرائیلی کینسیت کے انتخابات کے قریب آتے ہی یہ سیاست اپنی تمام تر ہولناکیوں، سفاکیت اور عریانی کے ساتھ ایک ایسے خوفناک موڑ پر آ چکی ہے جہاں سوال یہ نہیں رہا کہ "امن کا مسیحا کون ہے؟" بلکہ اصل دوڑ اس بات پر لگی ہوئی ہے کہ ''فلسطینیوں کو ان کی مٹی سے اکھاڑ پھینکنے اور ان کا نام و نشان مٹانے میں کون سب سے آگے ہے؟''

دائیں بازو کی مکروہ دوڑ: اقتدار کے لیے انسانیت کا سودا

آج قابض اسرائیل کا سیاسی منظرنامہ داخلی گردابوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف سوسائٹی کے اندر حکومت کی تبدیلی کی لہر ہے، مہنگائی اور زندگی گزارنے کی بڑھتی ہوئی لاگت کے ستائے ہوئے عوام ہیں، عدالتی اصلاحات پر پھٹنے والے تنازعات ہیں اور دوسری طرف سات اکتوبر کی سکیورٹی اور عسکری ناکامیوں کے وہ گہرے زخم ہیں جن پر اب تک پردہ نہیں ڈالا جا سکا۔ ان تمام داخلی بحرانوں سے عوام کی توجہ ہٹانے اور انتخابی ڈبے اپنی طرف کھینچنے کے لیے دائیں بازو کے انتہا پسند رہنماؤں نے ایک بار پھر فلسطینی کاز کو نوچنے اور اس پر سیاسی سودے بازی کرنے کا پرانا اور گھٹیا شیطانی کھیل شروع کیا ہے۔

دلچسپ اور تشویشناک امر یہ ہے کہ یہ نام نہاد انتخابی مقابلہ اب محض دائیں اور بائیں بازو کے روایتی نظریاتی اختلاف تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ خود دائیں بازو کے کیمپ کے اندر ایک ایسی ہلاکت خیز خانہ جنگی کی شکل اختیار کر چکا ہے جہاں ہر انتہا پسند رہنما دوسرے سے بڑھ کر فلسطینیوں کے خلاف خون آشام پالیسیاں پیش کرنے کی گھناؤنی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔

ایک طرف قابض حکومت کا سربراہ بنجمن نیتن یاھو ہے، جو اپنے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے سیاسی اتحاد کو جوڑنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ وہ اس بات سے سخت خوفزدہ ہے کہ اگر اس کے حلیف الگ الگ انتخابی لسٹوں کے ساتھ میدان میں اترے تو وہ انتخابی حد (Electoral Threshold) کو عبور کرنے میں ناکام ہو جائیں گے، جس سے دائیں بازو کا مجموعی ووٹ بینک اس طرح بکھر جائے گا کہ آئندہ حکومت کی تشکیل ان کے لیے خواب بن کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف اتمار بن گویر اور بزازیل سموٹریش جیسے خون کے پیاسے انتہا پسند گماشتے نیتن یاھو کو بلیک میل کرنے اور دائیں بازو کے شدت پسند ووٹروں کی واحد نمائندگی حاصل کرنے کے لیے فلسطینیوں کے خلاف بدترین تشدد کے ایجنڈے کو ہوا دے رہے ہیں۔

میسرہ بحر جیسے سیاسی تجزیہ کار بجا طور پر یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ غزہ سے فلسطینیوں کی جبری نقل مکانی کی فائل کو عین انتخابات کے وقت اچھالنا کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ بن گویر بخوبی جانتا ہے کہ انتخابی عصبیت کو بھڑکانے اور دائیں بازو کے اندر اپنے حریفوں کو مات دینے کے لیے اس سے مؤثر اور زہریلا کوئی دوسرا ہتھیار نہیں ہو سکتا۔ فلسطینیوں کی جبری نقل مکانی کو کسی بھی آئندہ حکومتی اتحاد کی تشکیل کے لیے ''بنیادی شرط'' بنا دینا دراصل اسی انتخابی عصبیت میں براہ راست سرمایہ کاری ہے۔ دوسری طرف نیتن یاھو کی مجبوریاں یہ ہیں کہ وہ ایک طرف اس شدت پسند دائیں بازو کے ساتھ اپنا ناگزیر اتحاد برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف ان کے بڑھتے ہوئے اور غیر انسانی مطالبات کے بوجھ تلے دبتے چلے جا رہے ہیں۔

''رضا کارانہ ہجرت'' کا فریب: نعرے سے خوفناک سیاسی منصوبے تک

اس انتخابی منڈی میں سب سے بڑا اور ہولناک سودا غزہ کی پٹی سے فلسطینیوں کی جبری نقل مکانی کا ہے۔ ممتاز مصنف اور سیاسی تجزیہ کار زیاد القرا اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ فلسطینیوں کو بے دخل کرنے کا یہ جنون اب محض چند ٹکڑوں پر مشتمل متفرق اور اشتعال انگیز بیانات کی حد تک باقی نہیں رہا، بلکہ یہ ایک باقاعدہ، سوچا سمجھا اور منظم سیاسی و انتخابی پروگرام کی شکل اختیار کر چکا ہے جس پر صہیونی جماعتیں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی شرطیں لگا رہی ہیں۔

آج قابض اسرائیل کی انتخابی دوڑ میں یہ سوال یکسر غائب ہو چکا ہے کہ ''جنگ بندی کون لائے گا؟'' یا ''خطے میں امن کی راہ کیسے نکلے گی؟'' اس کی جگہ اب صرف ایک ہی درندہ صفت سوال گونجتا ہے ''اپنے وطن سے فلسطینیوں کو باہر نکالنے اور ان کی نسل کشی کرنے میں کون زیادہ آگے جا سکتا ہے؟''

اس کی عملی تصویر ہمیں قابض ریاست کے وزیر دفاع یسرائیل کاٹز کے اس برملا اشتعال انگیز اعلان میں ملتی ہے جس میں انہوں نے فلسطینیوں کی ہجرت کو غزہ کا ''مستقبل'' قرار دیا تھا۔ اسی طرح اتمار بن گویر نے ایک قدم آگے بڑھ کر سات سال پر محیط ایک باقاعدہ تفصیلی منصوبہ پیش کر ڈالا ہے جس کا ہدف غزہ کی پٹی سے تقریباً اٹھارہ لاکھ ساٹھ ہزار فلسطینیوں کو جبراً اکھاڑ کر باہر پھینکنا ہے۔ اس شیطانی مقصد کے نفاذ کے لیے انہوں نے ایک خصوصی حکومتی ادارہ قائم کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے جسے وہ دیدہ دلیری اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ ''ہجرت کا ادارہ'' کہتا ہے۔

مگر زیاد القرا اس نام نہاد ''رضا کارانہ ہجرت'' کے فریب کا پردہ چاک کرتے ہوئے سچائی بیان کرتے ہیں کہ جب کسی قوم کے گھروں کو بارود سے مسمار کر دیا جائے، ان کے خاندانوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے، ان پر صدیوں کا محاصرہ مسلط کر دیا جائے، انہیں زندگی کی بنیادی ضرورتوں یعنی ایک بوند پانی اور دو وقت کی روٹی تک سے محروم کر دیا جائے، اور پھر ان سے یہ پوچھا جائے کہ ''کیا تم اپنی مرضی سے یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟'' تو یہ رضا کارانہ انتخاب کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو طاقت کے اندھے استعمال، جبر اور دہشت کے ذریعے مسلط کردہ اس حقیقت کا دوسرا نام ہے جسے یہ سفاک قاتل ''لسانی پردوں'' کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ بن گویر اس مکروہ ایجنڈے کو پیش کر کے دائیں بازو کے انتہا پسند عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اس ہجرت کو عملی جامہ پہنانے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

مغربی کنارہ: زمین کا الحاق اور گھٹتا ہوا دائرہ

جب غزہ کی پٹی پر یہ قیامت ڈھائی جا رہی ہو تو مقبوضہ مغربی کنارے کا خطہ اس سے کسی طور محفوظ نہیں ہے۔ یہاں یہ شیطانی کھیل ایک دوسرے روپ میں کھیلا جا رہا ہے لیکن اس

کا بنیادی ہدف ایک ہی ہے۔فلسطینیوں کے لیے زمین کا رقبہ اتنا تنگ کر دینا کہ ان کا سانس لینا بھی محال ہوجائے۔

بزازیل سموٹریش اس محاذ کے سب سے بڑے علمبردار کے طور پر ابھرتے ہیں۔وہ مغربی کنارے میں یہودی بستیوں (یہودی آبادکاری) کے جال کو پھیلانے،نئی اور نا قابلِ تسخیر زمینی حقائق مسلط کرنے اور فلسطینی اراضی کے چپے چپے پر قابض ریاست کا آہنی شکنجہ مضبوط کرنے کے لیے اپنے سیاسی منصب کو بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔ایک طرف غزہ کے مفلوک الحال اور زخم رسیدہ انسانوں کو جبری نقل مکانی کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے،تو دوسری طرف مغربی کنارے کے جغرافیائی اور ڈیموگرافک نقشے کو اس بے دردی سے نوچا جا رہا ہے کہ آنے والے کل میں وہاں کسی بھی فلسطینی ریاست کے قیام کا کوئی جغرافیائی جواز ہی باقی نہ رہے۔

زیادالقرا انتہائی بجا طور پر خبردار کرتے ہیں کہ خطرہ صرف اس بات تک محدود نہیں ہے کہ چند انتہا پسند لیڈر زبان سے فلسطینیوں کو نکالنے کی گیدڑ بھبکیاں دے رہے ہیں اصل خطرہ ان گہرے اور مکارانہ منصوبوں اور جزوی ترتیبات میں چھپا ہے جو چپکے چپکے فلسطینی باشندوں کو الگ تھلگ جزیروں میں محصور کرنے،غزہ کی پٹی کی مکمل جغرافیائی تشکیل نو کرنے اور انسانی یا اقتصادی امداد کے خوشنما عنوانات کے آڑ میں ایک نئی اور نا قابلِ واپسی نوآبادیاتی حقیقت کو پختہ کرنے کے درپے ہیں۔

برطانوی اخبار ''گارڈین'' کا چشم کشا انکشاف

برطانوی مؤقر اخبار ''گارڈین'' نے اپنی ایک تفصیلی رپورٹ میں اس گھناؤنے منصوبے کو بے نقاب کرتے ہوئے خطرے کی گھنٹی بجائی ہے۔گارڈین کے مطابق غزہ سے جبری نقل مکانی،بستیوں کی توسیع اور مغربی کنارے کے الحاق کے یہ مطالبات اب صہیونی انتہا پسندوں کے محض ''حاشیے کے بیانات'' یا سیاسی لفاظی نہیں رہے، بلکہ یہ اب قابض ریاست کے فیصلہ سازی کے مراکز اور حکومتی ایوانوں کی سرکاری پالیسیوں میں ڈھل چکے ہیں۔

نسرین ملک نے گارڈین میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں اس دردناک سچائی کو اجاگر کیا ہے کہ فلسطینیوں پر جو کچھ گزر رہی ہے،اس کے بھیانک حجم اور عالمی برادری کے ردعمل کے درمیان ایک اتھاہ اور شرمناک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ایک طرف غزہ میں نسل کشی،قتل عام اور تباہی کا نہ رکنے والا سلسلہ ہے،اور دوسری طرف مغربی کنارے میں گھروں کی مسماری،انتہا پسند یہودی آبادکاروں کی غنڈہ گردی اور ریاستی دہشت گردی کا راج ہے۔ادھر مغربی دارالحکومتوں کا عالم یہ ہے کہ وہ زبانی کلامی مذمت کے روایتی کھوکھلے الفاظ ادا کرنے یا نام نہاد پابندیوں کی باتیں کرنے پر اکتفا کیے ہوئے ہیں،جبکہ اندرخانہ یہی مغربی ممالک قابض ریاست کو قتل و غارت کے لیے جدید ترین اسلحہ برآمد کرنے کے لائسنس بلاجھجک جاری کر رہے ہیں۔

گارڈین خاص طور پر صہیونی قومی سلامتی کے وزیر اتمار بن گویر اور وزیر جنگ یسرائیل کاٹز کے ان بیانات کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے جہاں وہ سینہ تان کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ ان کی حکومت لاکھوں فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے باہر دھکیلنے کے لیے ہر ممکن طریقے سے لیس اور تیار ہے۔اخبار اس بات پر شدید تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ جب یہ خطرناک نظریات عام غنڈوں یا حاشیے کے سیاست دانوں کے نہیں بلکہ سیکورٹی اداروں کے سربراہان اور حکومت کے بااختیار وزراء کے منہ سے نکلیں،تو سیاسی خطاب اور زمینی انتظامی پالیسی کے درمیان فرق کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

گارڈین نے صہیونی قومی سلامتی کونسل کے سابق سربراہ گیورا ایلینڈ کے اس اعتراف کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ قابض ریاست کے لیے صدارتی یا بین الاقوامی منصوبوں کو قبول کرنے کا مقصد ہرگز دائمی امن کی طرف بڑھنا نہیں ہے، بلکہ غزہ کو برسوں تک ایک نا قابلِ رہائش کھنڈر کی حالت میں رکھنا صہیونی استعماری مفادات کے زیادہ بہتر طریقے سے خدمت کرتا ہے۔اسی طرح انتہا پسند سیاستدان موشے فگلین کے وہ خیالات بھی عیاں کیے گئے جن میں اس نے غزہ چھوڑنے سے صاف انکار کرنے والے فلسطینیوں کو جبراً نکالنے کے لیے بدترین اور ستمگر دباؤ کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کھلم کھلا تجویز دی۔

عالمی ضمیر کی مجرمانہ خاموشی اور فلسطینیوں کی بے بسی

یہ تمام ہولناک مناظر اس سوال کو جنم دیتے ہیں کہ آخر عالمی برادری اس انسانی ڈرامے پر اتنی بے حس اور خاموش تماشائی کیوں بنی ہوئی ہے؟ کیوں بین الاقوامی ادارے جبری نقل مکانی اور الحاق کی ان کھلی دھمکیوں کو محض ''انتہا پسندوں کا مؤقف'' قرار دے کر ٹال دیتے ہیں، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ انتہا پسند اب اقتدار کے اصل سرچشمہ اور ریاست کے تمام کلیدی اداروں کے مالک بن چکے ہیں۔

گارڈین کا یہ نکتہ بالکل درست ہے کہ پابندیوں یا عملی اقدامات کے بغیر صرف مذمتی قراردادیں پاس کرنا قابض ریاست کو کھلی چھوٹ دیتا ہے کہ وہ بین الاقوامی قوانین کو روندتی چلی جائے۔اگرچہ بعض انتہا پسندانہ منصوبوں کو وقتی طور پر زمینی یا سفارتی رکاوٹوں کا سامنا ہوسکتا ہے،لیکن صہیونی دائیں بازو کے اس خونی سیاسی ایجنڈے کے بنیادی خدوخال زمین پر حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔

اس پوری دوڑ میں فلسطینی فریق کسی بھی سیاسی مساوات میں ایک بااختیار فریق یا اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے شراکت دار کے طور پر موجود نہیں بلکہ اسے محض ایک ایسے ''محور'' کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے جس کے گرد دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتیں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں۔نیتن یاھو اپنے اقتدار کو بچانے کی فکر میں ہیں،بن گویر شدت پسندوں کے مسیحا بننے کی دوڑ میں ہیں اور سموٹریش مغربی کنارے کو نگلنے کے درپے ہیں اور یہ سب کچھ غزہ کے لاکھوں مظلوم انسانوں کی لاشوں پر کھڑے ہوکر ہورہا ہے۔

قابض اسرائیل کے آنے والے اکتوبر 2026ء کے انتخابات اس بات کا غماز ہیں کہ یہ دوڑ اب صرف اس پر نہیں ہے کہ حکومت کی کرسی پر کون بیٹھے گا، بلکہ یہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک اور سفاک سوال پر ہے ''فلسطینیوں کے خلاف کون سب سے زیادہ سخت، غیر انسانی اور تباہ کن پالیسیاں مسلط کرسکتا ہے؟ یہودی آبادکاری کے پھیلاؤ،جبری نقل مکانی اور دھرتی کے جغرافیے کو مسخ کرنے میں کون کس سے بازی لے جاسکتا ہے؟''

اگر عالمی ضمیر اس مجرمانہ خاموشی سے بیدار نہ ہوا اس بات کو نہ سمجھا گیا کہ جو کچھ کل تک محض انتہا پسندوں کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تھے آج زمینی پالیسیاں بن چکے ہیں،تو فلسطین کی مٹی پر انسانیت کا جو جنازہ اٹھے گا،اس کا کفن پوری دنیا کے منہ پر ہمیشہ کے لیے ایک انمٹ داغ بن کر چمٹا رہے گا۔

تاریخِ مسجد اقصیٰ: تقدس، عظمت اور تاریخی ارتقاء

مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول، مکہ و مدینہ کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام اور تاریخِ انسانی کا ایک عظیم ترین مرکز ہے۔ یہ صرف ایک عمارت کا نام نہیں بل کہ یہ صدیوں پرانی تہذیب، انبیاء کی سرزمین اور اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

اس طرزِ حکمرانی کے تقریباً 300 سال بعد، سلطنتِ فارس (ایران) نے حملہ کر کے 614 عیسوی میں یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس حملے میں یہودیوں نے فارسیوں کی مدد کی اور اندرونی طور پر تخریب کاری کی، جس کے نتیجے میں زیادہ تر گرجا گھروں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ انہوں نے 'کنائس القیامہ' (Church of the Holy Sepulchre) پر چھاپہ مارا، اسے لوٹا اور ''حقیقی صلیب'' (True Cross) کو اپنے دارالحکومت مدائن (Ctesiphon) لے گئے۔ اسی دور میں مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ رومی دوبارہ یروشلم فتح کر لیں گے، جیسا کہ سورہ روم میں نازل ہوا۔

مکہ کے مشرکین نے آپ کا کھلم کھلا مذاق اڑایا اور کہا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

جیسا کہ پیشگوئی کی گئی تھی، چند ہی سالوں میں فارسیوں کے پیر رومیوں کے مقابلے میں اکھڑنے لگے (تقریباً 624 عیسوی)۔ یہ وہی وقت تھا جب مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ بالآخر 630 عیسوی میں 'جنگِ نینویٰ' میں ہرقل نے فارسیوں کو شکست دی اور عیسائیوں نے دوبارہ یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یہودیوں کو یروشلم سے جلاوطن کر دیا گیا اور ان کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس موڑ پر رومیوں کو یہودیوں سے سیاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی دشمنی بھی تھی۔ یہ وہی دور تھا جب ہرقل کے دربار میں نبی کریم ﷺ کا خط پہنچا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔

حالات سازگار ہونے پر 'سفرونیوس' (Sophronius) کو یروشلم کا بڑا پادری (Patriarch) مقرر کیا گیا۔ یروشلم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور تک رومی سلطنت کے زیرِ اثر رہا۔

اس حصے کو ختم کرنے سے پہلے، اس چیز پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جسے ''ہیکلِ سلیمانی'' (Temple of Solomon) کہا جاتا ہے۔ عبرانی زبان میں 'ٹیمپل' کا مطلب 'خدا کا گھر' ہے۔ آج کے یہودی جسے ہیکلِ سلیمانی کہتے ہیں وہ ایک جھوٹ ہے، کیونکہ وہ کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) اپنی زندگی کے آخری ایام میں (معاذ اللہ) بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی کتابیں اس مفروضہ ہیکل کی تفصیلات پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں اور اس کے بارے میں لکھی گئی ہر چیز میں شدید مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ، کوئی بھی دوسرا تاریخی ماخذ اس ہیکل کا ذکر نہیں کرتا جو ان کے دعوے کی تصدیق کر سکے۔

بائبل کے مطابق ہیکل 60 ہاتھ لمبا (30 میٹر)، 20 ہاتھ چوڑا (10 میٹر) اور 30 ہاتھ اونچا (15 میٹر) تھا۔ اس کے سامنے والا صحن 20 ہاتھ لمبا اور 10 ہاتھ چوڑا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، ہیکل کا کل سائز 30m x 10m x 15m تھا، اور اس کا رقبہ 300 مربع میٹر تھا، جس کی بلندی چار یا پانچ منزلہ عمارت کے برابر بنتی ہے۔ یہ سوچنا عقل سے بالاتر ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمارت کے لیے 6.1 ٹن سونا، 16 ٹن

چاندی اور دیگر قیمتی اشیاء استعمال کی گئیں، اور 1 لاکھ 80 ہزار مزدوروں نے سات سال تک اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ، یہودی اس کے مقام پر بھی متحد نہیں تھے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ یہ نابلس میں تھا نہ کہ یروشلم میں، جبکہ دوسرے اس کے برعکس دعویٰ کرتے تھے۔

اگر اتنی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی ہوتی، تو یہ ناقابلِ فہم ہے کہ اس کی تفصیلات پر اس قدر اختلاف ہوتا۔ ہیکلِ سلیمانی کی یہ کہانی ایک بے بنیاد جھوٹ ہے۔ یہاں ہوا یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ بائبل بابل کی قید کے دور میں لکھی گئی تھی، اور ہم جانتے ہیں کہ کئی سالوں کی قید کے بعد یہودیوں کو فلسطین واپسی کی اجازت ملی تھی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ لکھنے والوں (تحریف کرنے والوں) نے ہیکل کے بارے میں کچھ مبالغہ آمیز قصے شامل کر دیے تاکہ یہودیوں کو یروشلم واپسی کی ترغیب دی جا سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ذریعے تھوڑی سی قیمت (دنیاوی فائدہ) حاصل کر لیں۔ سو ان کے لیے ہلاکت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہے ان کے لیے اس کی وجہ سے جو وہ کما رہے ہیں۔'' [سورہ البقرہ: 79]

ہیکلِ سلیمانی دراصل وہی مسجدِ اقصیٰ ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد دوبارہ تعمیر کیا اور اس کی دیکھ بھال کی۔

یہودی ذرائع کے مطابق:

یہودی ذرائع کے مطابق: پہلی بار ہیکل کو بابلی حکمران بخت نصر نے 586 قبل مسیح میں تباہ کیا۔ اس کے کئی عشروں بعد بابل میں قید یہودیوں کو یروشلم واپس جانے کی اجازت ملی، چنانچہ وہ واپس آئے اور تقریباً 521 قبل مسیح میں ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا۔ پھر رومی شہنشاہ ویسپاسیان کے بیٹے ٹائٹس (Titus) کے ہاتھوں ہیکل دوبارہ تباہ ہوا۔ یہ ہیکل کی دوسری تباہی تھی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہودی ہیکل کو نہ بھولیں اور یہ ان کی یادوں میں زندہ رہے، ان کے ربیوں نے ایسی رسومات اور تقریبات متعارف کرائیں جو ہر یہودی ہیکل کی یاد میں ادا کرتا ہے؛ جیسے کہ پیدائش کے وقت، موت کے وقت، شادی کے موقع پر، اور گھر کو پینٹ کرتے وقت وغیرہ۔

ہیکل کی دوسری تباہی عبرانی مہینے 'اب' (Ab) کی نویں تاریخ کو ہوئی تھی۔ یہودی اس واقعے کی یاد میں ہر سال اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ 313 عیسوی میں شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کی اور گرجا گھر بنوانا شروع کیے۔ اس دور میں تعمیر ہونے والا پہلا چرچ 'کنائس القیامہ' (Church of the Resurrection) تھا، جبکہ ہیکل والی جگہ کو یہودیوں کی تذلیل کے لیے کوڑے دان (کچرا کنڈی) میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

135 عیسوی میں (شہنشاہ ہیڈرین کے دور میں) شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا اور یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کی جگہ ایک نیا شہر بسایا گیا جس کا نام 'ایلیا کیپیٹولینا' (Aelia Capitolina) رکھا گیا۔ یہ شہر اسی نام سے جانا جاتا رہا یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان وہاں داخل ہوئے اور اس کا نام القدس یا بیت المقدس پڑ گیا۔

خلافتِ عمری میں فتحِ یروشلم

مسلمانوں نے 638 عیسوی میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بغیر کسی خون خرابے کے یروشلم کے دروازے کھولے، کیونکہ وہ بھی اس سرزمین کو یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح بابرکت اور مقدس مانتے تھے۔ انہوں نے شہر کا محاصرہ کیا یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو گئے۔

اس فتح کے آثار پہلے ہی سے سب کے سامنے واضح تھے۔ اس فتح کی پیشگوئی نبی کریم ﷺ نے غزوۂ خندق کے دوران فرمائی تھی۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب مدینہ کے باہر فوج کو روکنے کے لیے خندق کھودی جا رہی تھی، تو ایک بہت بڑی چٹان رکاوٹ بن گئی جسے کوئی کلہاڑی نہ توڑ سکی۔ وقت نکلا جا رہا تھا اور لوگوں میں خوف اور بھوک بڑھ رہی تھی، تب نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور کلہاڑی تھامی۔ آپ ﷺ نے ''بسم اللہ'' کہہ کر چٹان پر وار کیا جس سے اس کا ایک ٹکڑا ریزہ ریزہ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے شام کی چابیاں دے دی گئی ہیں؛ میں اس وقت وہاں کے سرخ محلات دیکھ رہا ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے دوسرا وار کیا اور فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے فارس (ایران) کی چابیاں دے دی گئی ہیں؛ میں مدائن کا سفید محل دیکھ رہا ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے آخری وار کیا اور فرمایا: ''اللہ اکبر! مجھے یمن کی چابیاں دے دی گئی ہیں، اللہ کی قسم! میں یہاں سے صنعاء کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔''

جب مسلمانوں نے یروشلم فتح کیا، تو وہاں کے بطریق (Patriarch) نے شہر کی چابیاں کسی کو بھی دینے سے انکار کر دیا اور یہ شرط رکھی کہ مسلمانوں کا امیر خود آ کر چابیاں وصول کرے۔ جب اس شرط کی اطلاع ملی، تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ سے روانہ ہوئے؛ آپ تنہا سفر کر رہے تھے اور آپ کے ساتھ صرف ایک اونٹ اور ایک خادم تھا۔ پورے سفر کے دوران وہ باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ جب وہ یروشلم کے قریب پہنچے، تو اونٹ پر سوار ہونے کی باری خادم کی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ یہ تھا عدلِ فاروقی۔

امام حاکم اپنی کتاب 'المستدرک' میں روایت کرتے ہیں:

''وہ دریا کے ایک گھاٹ پر پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اونٹ سے نیچے اترے، اپنے جوتے یا چمڑے کے موزے اتارے، انہیں اپنے کندھے پر رکھا، اپنے اونٹ کی نکیل تھامی اور گھاٹ میں اترنا شروع کیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر کہنے لگے: 'اے امیر المؤمنین! آپ یہ کر رہے ہیں؟! آپ نے اپنے موزے اتار کر کندھے پر رکھ لیے، اونٹ کی نکیل پکڑ لی اور گھاٹ میں اتر گئے؟! میں نہیں چاہتا کہ اس سرزمین کے لوگ آپ کو اس حال میں دیکھیں۔'

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی الفاظ کہے جو آج تک ہماری کتابوں میں امر ہیں:

اے ابوعبیدہ! کاش یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی۔ تم نے امتِ محمدیہ ﷺ کے لیے ایک سبق بنا دیا ہے! ہم ذلیل ترین لوگ تھے لیکن اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت اور غلبہ عطا کیا۔ اگر ہم اس (اسلام) کے علاوہ کسی اور چیز میں عزت تلاش کریں گے جس کے ذریعے اللہ نے ہمیں عزت دی ہے، تو وہ ہمیں (دوبارہ) ذلیل کر دے گا۔''

(جاری ہے)

صورت حال: مسعود ابدالی

اسرائیلی فوجیوں کی گواہی یا ایک متنازع دستاویزی فلم؟؟؟

اسرائیل میں بننے والی دستاویزی فلم NAZA اس وقت عالمی میڈیا اور فلمی دنیا میں غیر معمولی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستانی کے الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر اس خبر کو مناسب جگہ نہیں ملی۔ یہ فلم محض اس لیے اہم نہیں کہ اس میں غزہ کی جنگ پر تنقید کی گئی ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اسے دو اسرائیلی فلم سازوں، Yuval Abraham اور Rachel Szor نے بنایا ہے اور اس میں 24 ایسے اسرائیلی فوجی اور انٹیلی جنس اہلکاروں کے گمنام بیانات شامل ہیں جو مبینہ طور پر غزہ میں جنگی کارروائیوں اور اہداف کے انتخاب کے نظام سے وابستہ رہے ہیں۔ فلم کے مطابق ان اہلکاروں نے اسرائیلی فوج کے جدید نگرانی اور مصنوعی ذہانت (AI) پر مبنی نظام، خصوصاً Lavender، کے استعمال اور غزہ میں اہداف کے انتخاب کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعض بیانات میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایسے گھروں کو بھی نشانہ بنایا گیا جہاں خاندان اور بچے موجود ہونے کا علم تھا۔ ایک انتہائی پریشان کن بیان میں فلسطینی بچوں کی فون کالز اور ان کے والدین سے رابطے تک کو نگرانی کے نظام میں استعمال ہونے کا ذکر آتا ہے۔

وینس میں غیر معمولی استقبال

فلم کا عالمی اثر اس وقت مزید نمایاں ہوا جب 10 ستمبر کو وینس (Venice) فلم میلے میں اس کی افتتاحی نمائش ہوئی اور جب فلم ختم ہونے کے بعد فلم ساز اسٹیج پر آئے تو سارا مجمع کھڑا ہو کو 25 منٹ تک تالیاں بجاتا رہا۔ یہ وینس فلم میلے میں کسی بھی فلم کی طویل ترین پذیرائی تھی۔ حاضرین میں بعض افراد نے فلسطینی پرچم بھی اٹھا رکھے تھے۔ دو دن بعد فلم کو Special Jury Prize سے بھی نوازا گیا۔

یعنی NAZA نے محض ایک متنازع فلم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی دستاویزی کاوش کے طور پر عالمی توجہ حاصل کی ہے جس نے غزہ کی جنگ کو اسرائیلی فوجی اہلکاروں کی زبان سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس فلم سے ابھرتی AI ٹیکنالوجی کے بارے میں دنیا تشویش کا شکار ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کو محض ایک data point یا ہدف میں تبدیل کر دیا ہے۔

اس حوالے سے تازہ پیش رفت یہ ہے کہ اسرائیلی وزیرِ ثقافت مکی ظہر نے دونوں فلم سازوں کی اسرائیلی شہریت منسوخ کرنے کا اعلان کیا ہے جبکہ وزیر اعظم نیتن یاہو نے NAZA کو ''بدترین اشتعال انگیزی'' قرار دیا۔ یہ ردعمل خود اس بات کی علامت ہے کہ فلم نے اسرائیل کے اندر بھی ایک غیر معمولی سیاسی تنازع کھڑا کر دیا ہے اور اس جابرانہ طرزِ عمل نے مشرق وسطیٰ کی اکلوتی جمہوریت کے دعویداروں کی قلعی کھول دی ہے۔

"صدا بہ صحرا"
ناجائز ریاست کے وزیراعظم
کا خالی ہال سے خطاب
اور عالمی تنہائی کا منظر